قرآن فہمی بذریعہ کمپیوٹر

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی آواز میں

ترجمۂ قرآن اور دروسِ قرآن پر مشتمل دو کمپیوٹر CD تیار کر لی گئی ہیں

ترجمہ قرآن CD

قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور مختصر تشریح جامع متن قرآن

دورانیہ : 108 گھنٹے تعارفی قیمت : 175 روپے

الھدیٰ CD

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے 44 دروس پر مشتمل کمپیوٹر CD

دورانیہ : 44 گھنٹے تعارفی قیمت : 175 روپے

پیشکش :

شعبہ سمع و بصر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون : 3۔5869501 فیکس : 5834000

Email : aasif@brain..net.pk.

www.tanzeem.org.pk.

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

قرآن اکیڈمی لائبریری

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی
معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)
ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۷ | رجب المرجب ۱۴۱۹ھ ـ نومبر ۱۹۹۸ء | شمارہ ۱۱

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱
کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے
مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

یکم نومبر کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ۲۶واں سالانہ اجلاس حسب اعلان قرآن آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ معمول کی کارروائی کے علاوہ اس سال مجلس شوریٰ کے نصف ارکان کے انتخاب کا مرحلہ بھی درپیش تھا۔ یہ انتخابات ہر دو سال بعد منعقد ہوتے ہیں اور ارکان کا چناؤ چار سال کے لئے کیا جاتا ہے۔ بحمد اللہ کہ یہ مرحلہ بھی نہایت تسلی بخش انداز میں اور انتہائی پرسکون ماحول میں طے پایا۔ مرکزی انجمن چونکہ ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے لہٰذا سالانہ اجلاس کے موقع پر ضابطہ کی کارروائی بھی اجلاس کا مستقل حصہ ہوتی ہے جس میں سابقہ کارروائی کی توثیق' سالانہ حسابات کا پیش کیا جانا اور قواعد و ضوابط کے مطابق شوریٰ کے ارکان کے انتخابات شامل ہیں۔ مزید برآں سال بھر کی کارکردگی کا ایک اجمالی جائزہ اور آخر میں صدر مؤسس کا خطاب بھی حسب معمول اجلاس کا حصہ تھا۔ حسب سابق منسلک انجمنوں کے صدر حضرات کو بھی مرکزی انجمن کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ کراچی' پشاور' فیصل آباد اور سرگودھا کی انجمنوں کے صدر حضرات خاص طور پر اس اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور ہر ایک نے متعلقہ انجمن کی مختصر رپورٹ بھی اجلاس میں پیش کی۔

اس سالانہ اجلاس کی مفصل رپورٹ انتخابات کے نتائج کے اعلان سمیت' ان شاء اللہ اگلے شمارے میں ہدیۂ قارئین کی جائے گی' تاہم یہاں اس اجلاس کے حوالے سے اپنا یہ تأثر ضرور ہم اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ دیگر اداروں کے بالکل برعکس ہمارے یہاں انتخابات نہایت پرسکون اور ہر نوع کی ہنگامہ آرائی سے پاک رہے۔ نہ کوئی گروپ بندی دیکھنے میں آئی' نہ کنوینگ کا ہنگامہ سنائی دیا' نہ کسی کھینچ تان کی نوبت آئی بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان انتخابات کے نتیجے میں منتخب ہونے والے اکثر ارکان وہ تھے جو اپنی کسی مجبوری کے باعث شریکِ اجلاس بھی نہ تھے۔ گویا ایک درجے میں مزاح کے پیرائے میں کہا جا سکتا ہے کہ "منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے"۔ بہرکیف آج کے دور میں ایک غیر کاروباری اور خالص دینی و مذہبی ادارے کا ۲۶ برس تک نہایت پرسکون

(باقی صفحہ ۸ پر)

حٰمٓ (۴۶)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ حٰمٓ○ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ○ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ○ ﴾ (الاحقاف : ۱-۳)

قرآن مجید کا چھبیسواں پارہ "حٰمٓ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں اولاً سورۃ الاحقاف ہے جو سلسلۂ حوامیم کی آخری سورت ہے' پھر تین سورتیں مدنی ہیں : سورۂ محمدؐ' سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات۔ اس کے بعد سورۂ ق اور پھر سورۃ الذاریات کا نصف اول ہے۔ جس طرح سورۃ الشوریٰ میں اسلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ کوئی نیا نویلا دین نہیں ہے بلکہ یہ وہی دین ہے جو حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام لے کر آئے' اسی طرح سورۃ الاحقاف میں فرمایا کہ اے نبی ﷺ ﴿ قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ (آیت ۹) "آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی نیا نویلا اور انوکھا رسول نہیں ہوں"۔ بلکہ انبیاء ورُسل کی اس مقدس جماعت کے سلسلہ کی آخری کڑی ہوں اور یقیناً مکمل اور اکمل کڑی ہوں' جو حضرت آدم علیہ السلام سے چلا آرہا ہے۔

سورۃ الاحقاف میں انسان کی شعوری زندگی کے آغاز کے وقت دو مختلف نقطہ ہائے نظر کا ذکر ہوا۔ قرآن مجید کی رُو سے انسان کے شعور کی پختگی اور عقلی بلوغ کی عمر چالیس برس ہے' فرمایا کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اس عمر کو پہنچتے ہیں تو ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے :

﴿ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۭ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ ﴾ (آیت ۱۵)

"اے رب! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیرے ان احسانات کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے۔ مجھے توفیق دے کہ میں نیک عمل کر سکوں۔ میرے لئے میری اولاد کو بھی نیک اور صالح بنا دے۔ میں تیری جناب میں رجوع کرتا ہوں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تیرا ایک فرمانبردار بندہ ہوں"۔

اس کے برعکس ایک دوسری روش بھی ہے کہ مسلمان والدین اپنی اولاد کو اگر دین کی دعوت دیتے ہیں اور آخرت سے ڈراتے ہیں تو کچھ لوگ جواباً اس طرح کہتے ہیں : ﴿ اُفٍّ لَّکُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ﴾ (آیت ۱۷) تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسی احمقانہ قسم کی باتیں کرتے ہو! کیا تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ جب میں مر جاؤں گا اور گل سڑ کر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاؤں گا تو میں دوبارہ اُٹھایا جاؤں گا؟ ـــــ معلوم ہوا کہ یہ دو مختلف راستے ہیں جو بلوغ کی عمر کو پہنچنے کے بعد لوگ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پہلا راستہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

سورۃ الاحقاف میں حضرت ہود علیہ السلام کا بھی ذکر ہے اور آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک واقعہ بھی کہ جنّوں کی ایک جماعت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُس نے آپؐ سے قرآن سنا، آپؐ پر ایمان لائی اور پھر اس کی دعوت اس نے اپنی قوم کو دی : ﴿ یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ ﴾ (آیت ۳۱) "اے ہماری قوم والو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے گا"۔

اس کے بعد قرآن حکیم میں تین مدنی سورتیں وارد ہوئیں : "سورۂ محمدؐ"

(ﷺ) جس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا' یہ مدد کا معاملہ یک طرفہ نہیں چل سکتا : ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۝﴾ (محمد : ۷) "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے (اور اس کے رسول کی مدد کرو گے' اس کے دین کو دنیا پر غالب کرنے کے لئے جان اور مال کھپاؤ گے) تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا"۔ اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر تنبیہًا دوبارہ ارشاد فرمایا : ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ﴾ (آیت ۳۸) اگر تم نے انحراف کیا یا پیٹھ موڑی تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی راندۂ درگاہ کر کے کسی اور قوم کو اپنے دین کی امانت سونپ دے گا اور اپنے دین کا جھنڈا اس کے ہاتھ تھما دے گا۔ اس سورۂ مبارکہ میں مسلمانوں کو قرآن مجید پر عمل اور غور و فکر کی دعوت انتہائی پُر زور الفاظ میں دی گئی : ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (آیت ۲۴) "کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں؟"۔

اس کے بعد سورۃ الفتح آتی ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ کے گرد گھومتی ہے' چنانچہ اس میں آغاز ہی صلح حدیبیہ کے ذکر سے ہوتا ہے : ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا﴾ (الفتح : ۱) اے نبی ﷺ اس صلح کی شکل میں' جو اگرچہ بظاہر آپ نے کسی قدر دب کر کی ہے' ہم نے آپ کو ایک فتح عظیم عطا فرمائی ہے۔ واقعہ یہ کہ اس فتح کے بعد اسلام کے عروج کا دَور شروع ہوا اور نبی اکرم ﷺ کو اندرونِ ملک عرب میں بھی اور دوسرے ممالک میں بھی اسلام کی دعوت پر اپنی توجہات مرتکز کرنے کا موقع ملا' جس کے نہایت دُور رَس نتائج نکلے۔ صلح حدیبیہ سے قبل بیعت رضوان ہوئی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ خبر اُڑ جانے پر کہ وہ شہید کر دیئے گئے ہیں حضور ﷺ نے ان کے انتقام کے لئے بیعت لی۔ اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم سے اپنے راضی ہو جانے کا اعلان فرمایا اور ان کے مقام و مرتبہ اور ان کی فضیلت کے اظہار میں اس سورۂ مبارکہ میں کہا کہ اے نبی ﷺ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ

﴿يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ (آیت ۱۰) "یہ لوگ جو آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں در حقیقت اللہ کی بیعت کر رہے ہیں" ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ "اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے"۔ ایک اور جگہ فرمایا: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ﴾ (آیت ۱۸) "اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جو آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے"۔ اس طرح اس سورۂ مبارکہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت اور ان کے اللہ سے راضی ہو جانے اور اللہ تعالیٰ کا ان کو راضی کر دینے کا اعلان ہوا۔ اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (آیت ۲۸) ہم نے الہدیٰ اور دین حق دے کر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ اس دین کو پورے نظام حیات پر غالب کر دیا جائے۔ یہ دین مغلوب رہنے کے لئے نہیں آیا اور اب ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب یہ دین غالب ہو جائے گا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (آیت ۲۹) اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہل ایمان' کفار کے مقابلے میں انتہائی سخت ہیں اور باہم ایک دوسرے کے لئے انتہائی نرم۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس مقدس جماعت کی روئے ارض پر کوئی مثل اور کوئی نظیر نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔

اس کے بعد سورۃ الحجرات آتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی زندگی کے اصول بیان ہوئے۔ پہلا اصول اللہ کی اطاعت کلی اور اس کا تقویٰ ہے۔ لہٰذا تقویٰ کا ذکر اس سورۂ مبارکہ میں بہ تکرار و اعادہ ہوا ہے۔ دوسرا اصول ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام' آپؐ کا ادب اور آپؐ کی تعظیم۔ آپؐ کا کوئی قول سامنے آ جائے تو فوراً زبانوں پر تالے پڑ جائیں' آپؐ کی آواز سے آواز بلند نہ ہونے پائے

اور آپؐ کی رائے کے مقابلے میں کوئی مسلمان اپنی رائے پیش کرنے کی جرأت نہ کرے۔ تیسرا اصول ہے مسلمانوں کی باہمی محبت و اُلفت اور ان کے مابین شفقت و محبت اور رحمت کا رشتہ۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں اس ضمن میں تفصیلی احکام دیئے گئے۔ ان تمام چیزوں سے روکا گیا جس سے مسلمانوں کے دِلی تعلقات میں رخنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ مسلمانو! یہ جان لو کہ اسلام اور ہے' ایمان اور ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ خدا کے ہاں واقعی اور حقیقی مومن شمار ہو تو سمجھ لو کہ اللہ کے نزدیک ایمان کا معیار یہ ہے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (الحجرات : ۵) "مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر شک میں نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اور کھپائیں انہوں نے اپنی جانیں بھی اور لگائے اس میں اپنے مال بھی"۔ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ "پس یہی لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں"۔

اس کے بعد سورۂ ق وارد ہوتی ہے۔ یہاں سے درحقیقت قرآن حکیم میں سات انتہائی حسین و جمیل سورتوں کا آغاز ہوتا ہے جن کی آیتیں چھوٹی چھوٹی ہیں' ان میں بڑی روانی ہے اور شوکت الفاظ اور بندش کا حسن بھی اپنے عروج کو پہنچا ہوا ہے۔ چنانچہ انہی سات سورتوں میں سورۃ الرحمٰن بھی ہے' جسے آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کی دلہن کہا ہے۔ سورۂ ق کا آغاز ہوا : ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ﴾ "قسم ہے اس بزرگی والے قرآن کی"۔ یہ دلیل ہے اپنی صداقت پر اور دلیل ہے محمد ﷺ کی صداقت پر بھی۔ اور اس کا اختتام ہوا اس حکم پر کہ اے نبی ﷺ ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ﴾ (آیت ۴۵) لوگوں کو تلقین کیجئے' تذکیر کیجئے' یاددہانی کرائیے اس قرآن کے ذریعے کہ جس میں ذرا بھی خوف خدا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھالے گا۔

اس کے بعد سورۃ الذاریات ہے جس افتتاح ہوتا ہے : ﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ (آیات ۱ تا ۶) لوگو! یہ نہ سمجھو کہ قیامت یا آخرت کی کوئی خالی دھونس ہے جو تمہیں دی جا رہی ہے' یہ ہونے والی بات ہے' یہ ایک شدنی امر ہے' یہ اٹل واقعہ ہے جو ہو کر رہے گا۔ جو دھمکی تمہیں دی جا رہی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے : ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ اور جزاء و سزا واقعی ہو کر رہے گی' لوگوں کو اپنے اعمال کے بدلے سے دوچار ہونا پڑے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝۝

بقیہ : حرفِ اول

انداز میں تسلسل استقلال کے ساتھ نہ صرف برقرار رہنا' بلکہ مسلسل وسعت پذیر ہونا سراسر اللہ کی توفیق اور نصرت ہی کا مظہر ہے۔ **فالحمدللہ علی ذلک**

مرکزی انجمن کے سالانہ قرآنی محاضرات کے لئے یکم تا ۴ نومبر کی تاریخوں کا تعین ہوا تھا۔ ان سطور کی تحریر تک محاضرات کے تین سیشن ہو چکے ہیں جبکہ چوتھا اور آخری سیشن ابھی باقی ہے۔ اس بار محاضرات انگریزی زبان میں ہیں اور ان کے مرکزی مقرر ٹرینیڈاڈ (ویسٹ انڈیز) سے تعلق رکھنے والے امریکہ میں مقیم معروف مسلم سکالر جناب عمران این حسین ہیں۔ ان محاضرات کی مفصل رپورٹ بھی اللہ نے چاہا تو آئندہ شمارے میں ہدیۂ قارئین کر دی جائے گی۔ ۝۝

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ایمان و عمل کا باہمی تعلق

مرتب : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا ہے؟ کیا ایمان و عمل کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ہے؟ آیا عمل ایمان کا جزو ہے یا اضافی چیز ہے؟ آیا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان صرف ایمان سے نکلتا ہے یا ایمان و اسلام دونوں سے نکل کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے؟ آیا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان کے ایمان و اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑتا یا کم و بیش کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے؟ ان سوالات کا جواب ہم بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ تفصیل مزید کے لئے آٹھ مسلکوں کے موقف اور دلائل کو دوبارہ دیکھ لیں۔

ایک اصولی قاعدہ

قرآن حکیم کا شروع سے آخر تک اہتمام سے بغور مطالعہ کر لیں تو شاذ[1] ہی کوئی مقام نظر آئے گا کہ جہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح[2] کا تذکرہ نہ ہو۔ اکثر و بیشتر "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ سورۃ العصر غالباً سب سے چھوٹی سورۃ ہے' اس میں بھی نہ صرف ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر ہے بلکہ اس کی مزید دو شاخوں کا بھی تذکرہ ہے۔ درحقیقت "تواصی بالحق و تواصی بالصبر" عمل صالح ہی کی دو شاخیں ہیں۔

عربی زبان میں "واو" کے مختلف استعمالات ہیں' کہیں "واو" عطف کے لئے استعمال ہوتی ہے اور کہیں تفسیر و بیان کے لئے لائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی "واو"

---

(۱) استثناءات تو ضرور موجود ہیں اور جہاں بھی استثناء ہے اس کے لئے کوئی نہ کوئی قرینہ بھی موجود ہے۔ (ماخوذ)

(۲) قرآن حکیم میں ایمان کے ساتھ اجمالاً یا تفصیلاً عمل صالح کا ذکر ۷۸ بار آیا ہے۔ (اضافہ از مرتب ابو عبدالرحمٰن)

کے متعدد استعمال ہیں۔ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" میں "واو" کو اگر عطف کے لئے مان لیا جائے تو مغائرت کے معنی دے گی یعنی ایمان اور چیز ہے اور عمل دوسری چیز۔ اور یہ دو علیحدہ حقائق (entities) ہیں لیکن اگر "واو" کو تفسیری قرار دے دیا جائے ("واو" کے مابعد والی عبارت ماقبل کی تفسیر بیان کر رہی ہے) تو پھر ان دونوں میں باہمی تلازم ثابت ہو جائے گا' جیسا کہ علامہ شبیر احمد بخاری صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا تھا کہ علامہ فارابی اور دورِ حاضر کے مفکرین میں سے سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ :

"ایمان و عمل صالح کا باہمی تعلق یوں سمجھ لیں کہ ایک ایمان غیر مرئی ہے جو دل میں ہوتا ہے اور کسی کو نظر نہیں آتا اور ایک ایمان مرئی ہوتا ہے جو اعمال و کردار کی شکل میں نظر آتا ہے ـــــ اور وہ ہے عمل صالح"۔

یہ تعبیر کا ایک انداز ہے۔ ایمان اور عمل صالح کے حوالے سے جو آٹھ مسلک بیان ہوئے تھے' ان کا خلاصہ ایک نظر دیکھ لیں تاکہ اگلی بات سمجھنی آسان ہو جائے :

خوارج : گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان و اسلام دونوں سے خارج ہو کر کافر ہو گیا' لہٰذا مرتد' واجب القتل' مباح الدم اور مباح المال ہے۔

معتزلہ : ایمان و اسلام سے خارج' البتہ کفر میں داخل نہیں ہوا' لہٰذا نہ مرتد' نہ واجب القتل اور نہ ہی مباح المال ہے۔

اہل تشیع : گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان سے خارج' البتہ مسلمان یا منافق۔ (۳)

محدثین : یعنی امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل' امام بخاری اور عموم محدثین (رحمہم اللہ) کا موقف یہ ہے کہ عمل ایمان کا جزو لازم ہے' البتہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے

---

(۳) اہل تشیع نے ایک زیادتی اور کی ہے کہ یہ فیصلے اسی دنیا میں کرنے شروع کر دیئے کہ فلاں مومن ہے' فلاں مسلمان ہے اور فلاں منافق ہے' حالانکہ ایمان اور نفاق کا صحیح فیصلہ تو قیامت کے روز ہی ہو سکتا ہے' اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ اس سے بڑی جسارت انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کی ہے کہ چند ایک کو مؤمن قرار دے کر باقی غالب اکثریت کو یا مسلمان مانا یا پھر منافق قرار دے دیا ہے ـــــ والعیاذ باللہ ـــــ (ماخوذ)

انسان اسلام سے خارج نہیں ہوتا[۴] بلکہ کیفیت ایمان میں کمی آجاتی ہے۔

احناف : سید الفقہاء امام ابو حنیفہ و دیگر ائمہ احناف (رحمہم اللہ) کے نزدیک عمل ایمان کا جزو نہیں ہے بلکہ یہ ایک علیحدہ حقیقت (entity) ہے۔ اور اس دنیا میں ایمان کا پیمانہ دعویٰ تصدیق اور اقرار باللسان ہوگا۔

اشاعرہ : ان کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے' اقرار بھی شرط نہیں' صرف اجراء احکام کے لئے "اقرار باللسان" ایک قانونی ضرورت ہے۔

مرجئہ : صرف اعتقاد کافی ہے اور مجرد اعتقاد ہی "نجات من النار" کا ضامن ہے۔

کرامیہ : اگر صرف زبانی کلمۂ توحید کا اقرار کرلیا تو بھی نجات کے لئے کافی ہے' دل میں تصدیق نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں' لہٰذا اس سے کوئی بحث نہیں اور عمل بھی کسی درجے میں شرط نہیں۔

ہمارے معاشرے میں بے عملی و بد عملی کی بنیادی وجہ

ہمارے ہاں علماء کرام' فقہاء عظام اور مفتیان دین پر جب فقیہانہ اور مفتیانہ انداز غالب آجاتا ہے تو قرآن حکیم اور احادیث رسول اللہ ﷺ میں جہاں جہاں انذار و ترہیب کا بیان آیا ہے جن میں بے عملی یا بد عملی کی وجہ سے ایمان کی نفی وارد ہوئی ہے یا جن مقامات پر "خلود فی النار" (آگ میں ہمیشہ رہنا) کی وعید آئی ہے' ان کی توجیہہ یا تشریح کرتے ہوئے ایسی ایسی شرطیں عائد کردیتے ہیں جس کے نتیجے میں ترہیب و انذار کا اثر بالکل ختم ہوجاتا ہے' بلکہ پڑھنے والا بے عملی و بد عملی میں مزید جری و بے باک ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کی عظیم اکثریت عملاً کرامیہ کے موقف پر کھڑی ہے کہ چونکہ ہم نے لا الٰہ الا اللہ زبان سے پڑھ لیا ہے اور کلمۂ توحید کا اقرار نجات کے لئے بہت کافی ہے اور حدیث مبارک کے یہ آسان سے الفاظ سب کو ازبر ہیں "مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

---

(۴) نماز کو چونکہ ایک خصوصی مقام حاصل ہے لہٰذا محدثین کی اکثریت کے نزدیک تارک نماز کافر ہے' دیگر گناہوں سے کفر لازم نہیں آتا' ملاحظہ ہو "نماز کی اہمیت" تالیف فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العیثمین ترجمہ ابو عبدالرحمٰن (اضافہ از مرتب)

اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ"(۵) لہٰذا عمل کی ضرورت نہیں۔ اس پر اضافی رنگ "تصورِ شفاعت" نے چڑھایا ہے کہ کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں! لہٰذا شفاعت محمدیؐ سے بیڑا پار ہو ہی جائے گا۔

ان دو عقیدوں میں غلو کا نتیجہ ہے کہ امت بے عمل بلکہ بد عمل ہو کر رہ گئی۔ اس طرح ہمارے ہاں کے عوام کی عظیم اکثریت عملاً کرامیہ کے موقف پر پہنچ گئی ہے کہ بس لا الٰہ اِلا اللہ پڑھ لیا اور باقی سارے دین سے آزادی۔ نہ فرائض و واجبات کی خبر ہے اور نہ حرام کی پروا۔ اس مقام سے جو لوگ ذرا آگے قدم بڑھاتے ہیں وہ بھی مرجیۂ کے موقف پر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ بس اعتقاد کی حد تک تو ہر چیز مانتے ہیں لیکن عمل میں وہ بھی کورے ہیں ـــــ چنانچہ اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے صحیح موقف کو عوام کے سامنے پیش کریں' اس کے لوازمات و متضمنات و مضمرات کو سامنے لائیں تاکہ عوام صحیح العقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دینی احکام و اقدار کی پابندی کرنے والے بھی بن جائیں۔ ورنہ اگر صرف فقیہانہ و مفتیانہ انداز سے دین کو پیش کیا گیا تو انذار و ترہیب سے متعلق ساری وعیدیں بے معنی اور بے وزن ہو کر رہ جائیں گی۔

سورۃ النساء آیت ۹۳ میں' جو وعید شدید پر مشتمل آیت ہے' اس ضمن میں تفصیلی گفتگو گزر چکی ہے۔ البتہ یہ بات تکرار کی مستحق ہے کہ اس آیت میں ترہیب و انذار کے پانچ اسلوب بیان کئے گئے ہیں جن سے آدمی لرز اٹھے گا۔ لیکن جب اس کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کے اندر ایسے الفاظ ذکر کئے جائیں جو کہ خالصتاً مفتیانہ ضرورت ہوا کرتے ہیں تو آیت کا سارا اثر ختم ہو کر رہ جائے گا' پڑھنے والے پر نہ کوئی اثر ہو گا اور نہ وہ کیفیت طاری ہو گی جسے قرآن یوں بیان کرتا ہے :

﴿ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ ﴾

(النازعات : ۴۰)

"اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری

---

(۵) کشف الاستار ۱/۱۱ ح ۷ و مسند احمد ۵/۲۳۶ علامہ الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے' ملاحظہ ہو سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ ح نمبر ۲۳۵۵۔ "جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا جنت میں داخل ہو گیا"۔

خواہشات سے باز رکھا تھا"

اس کے برعکس رجاء و امید کا پہلو غالب ہو جائے گا اور یہی بے عملی بلکہ بد عملی کی بنیاد ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کے ایک اور مقام پر غور فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ﴾ (البقرۃ : ۸۰-۸۱)

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں آگ چھو ہی نہیں سکتی مگر گنتی کے چند دن۔ اے نبی ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ جس کی وہ خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کر رہے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں، کیوں نہیں ایسا ہو سکتا جو کوئی بھی بدی کمائے گا اور اس کا گناہ اس کا احاطہ کرے گا تو وہ دوزخی ہے اور ہمیشہ ہی وہ دوزخ میں رہے گا"۔

پہلی آیت میں یہود کے غلط نظریئے کا تذکرہ کرنے اور اس کی پُر زور تردید کرنے کے بعد دوسری آیت میں ایک اصولی قاعدہ بیان کر دیا کہ بات حسب نسب کی نہیں بلکہ اعمال و کردار کی ہے، جو کوئی ایسا کرے گا ایسے انجام سے دوچار ہو گا۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مذکورہ کو سیاق و سباق کے پس منظر میں صرف یہود سے متعلق قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت میں کفارِ یہود کا تذکرہ ہے اور الفاظ میں موجود اس کے عموم کو باقی نہیں رکھا۔ چنانچہ جب کوئی مسلمان اسے پڑھے گا تو انہیں یہودیوں سے متعلق باتیں سمجھتے ہوئے خود لرزہ براندام نہیں ہو گا۔

البتہ حضرت شیخ الہند مولانا سید محمود حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۶) نے ترجمے میں عموم

---

(۶) میری رائے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم ہیں۔ اس صدی میں بہت سے لوگوں نے تجدید کی کوشش کی ہے لیکن ان سب میں عظیم ترین درجہ =

کو برقرار رکھا ہے' البتہ حاشیے میں "گناہ کسی کا احاطہ کرلے" کی تعبیر و تشریح میں لکھا ہے کہ :

"گناہ کسی کا احاطہ کرلے' اس کا یہ مطلب ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کرلے کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو' حتیٰ کہ دل میں ایمان و تسلیم باقی ہوگی تو بھی احاطہ مذکور محقق نہ ہوگا۔ تو اب کافر ہی پر یہ صورت صادق آسکتی ہے"۔

ذرا غور کریں کہ اس طرح کی تفسیر و تشریح پڑھنے کے بعد کون مسلمان چونکے گا؟ اس آیت میں جو تاثیر اور لرزا دینے والا انداز ہے وہ سب تاویلات میں لپیٹ کر بے اثر کردیا گیا۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ترجمے کے اندر بھی بریکٹ میں کچھ اضافے کئے ہیں جس سے اس کی نوعیت بدل جاتی ہے لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمے میں الفاظ قرآنی کے اندر موجود عموم کو اپنی اصل حالت پر رکھا ہے۔ البتہ جو حاشیے میں رائے دی ہے کہ یہ مرحلہ حالت کفر کے اندر ہی ہوسکتا ہے ورنہ ممکن نہیں ہے۔

ایک رائے.....ایک مشورہ

علیٰ وجہ البصیرۃ میری پختہ رائے یہ ہے کہ اس قسم کی آیات و احادیث کا ترجمہ لفظی مفہوم کے مطابق کردیا جائے تاکہ ان آیات و احادیث کے اندر موجود انذار اور ترہیب و وعید کی جو کیفیت ہے وہ اعصاب پر اپنے اثرات دکھائے اور پڑھنے والا کانپ کانپ اٹھے۔ امت کی اصلاح احوال کا صرف یہی ذریعہ ہے : "اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى" کی مطلوبہ و محمودہ کیفیت تب ہی پیدا ہوسکتی ہے۔

فتویٰ اور قانونی زبان کی ایک اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ لہٰذا علیحدہ ایک فتویٰ کی شکل میں وضاحت کردی جائے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کافر ہوگیا ہے اور اسلام سے نکل کر مرتد ہوگیا ہے' جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ : وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ کہ یہاں مراد حقیقی ایمان کی نفی ہے جس کا فیصلہ صرف اور صرف

= حضرت شیخ الہند کو حاصل ہے۔ اس قدر عظیم قدر و احترام کے باوجود میں اس مقام پر حضرت صاحب سے اختلاف کی جسارت کر رہا ہوں۔ (ماخوذ)

آخرت میں جا کر ہو گا' البتہ اس قانونی ایمان کی نفی نہیں ہے جس پر دنیا میں احکام لاگو ہوتے ہیں۔ یہ خالصتاً فتویٰ کی ضرورت ہے' اس کی وضاحت ہو جانی چاہئے۔ اس وضاحت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ "بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَا" کی کیفیت پیدا ہو گی جو کہ شرعاً مطلوب و محمود ہے۔ ایک طرف دل کانپ رہا ہے' خبر نہیں کہ حقیقی ایمان کی کیفیت گیا ہے؟ پتہ نہیں اللہ کے ہاں میرا ایمان قبول ہے بھی یا نہیں؟ میں تمام ارکان ایمان کو تسلیم کرتا ہوں' اعمال کے لئے بھی مقدور بھر کوشش کر رہا ہوں' مجھے یہ بھی یقین ہے کہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے کوئی مومن کافر نہیں ہو جاتا' بہرحال اللہ تعالیٰ کے حضور بہتر انجام کی اُمید ہے۔ ان دو کیفیات کی وجہ سے انسان میں ایک اعتدال پیدا ہو گا اور وہ خوف و اُمید کے درمیان رہے گا۔ ایک طرف سے ڈر بھی رہا ہو گا اور دوسری طرف سے پُر امید بھی رہے گا۔

شرعی اصطلاحات کی اہمیت

قرآنِ حکیم اور حدیثِ پاک میں کئی جگہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب پر ایمان کی نفی وارد ہوئی ہے' تو کیا اس سے مراد حقیقی ایمان کی نفی ہے یا ظاہری و قانونی ایمان کی نفی مراد ہے؟ اس مسئلے کے حل کی آسان اور عام فہم صورت یہ ہے کہ ایمان کے دونوں پہلوؤں کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لیا جائے۔

☆ حقیقی' قلبی اور باطنی ایمان : جو اصل ایمان ہے' آخرت میں نجات کا دار و مدار اسی پر ہو گا۔ احادیث میں اور بالخصوص حدیث جبریل میں اسی کو "الایمان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

☆ قانونی' زبانی اور ظاہری ایمان : دنیا میں اسی ایمان کا اعتبار ہے۔ احکام کا اجراء اسی ایمان کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ حدیث جبریل میں اس کو "الاسلام" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حدیث جبریل جو کہ اُمّ السُّنّہ بھی کہلاتی ہے' مکمل الفاظ' ترجمے اور تخریج کے ساتھ گزر چکی ہے اور اس سے پہلے سورۃ النساء آیت ۱۳۶ میں ایمان ظاہری و ایمان حقیقی اور ان کے درمیان باہمی ربط و تلازم کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔

حدیث جبریل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام مجمع عام میں انسانی شکل میں تشریف لائے۔ اور یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک کے آخری دنوں میں پیش آیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا : "فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ"۔ دوسری روایت میں ہے : "هٰذَا جِبْرِيْلُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ النَّاسَ دِيْنَهُمْ"۔ ایک اور روایت میں ہے : "هٰذَا جِبْرِيْلُ اَرَادَ اَنْ تُعَلِّمُوْا اِذْ لَمْ تَسْئَلُوْا"(۷) اس انداز و اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انتہائی اہم اور خاص بات تھی جو امت کو اس شان سے بتانی مقصود تھی۔ اصل میں یہ ایمان کا مسئلہ تھا جو کہ انتہائی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس بنیادی مسئلہ کا دوسرا اہم جزو یہ ہے کہ دنیا میں مسلمان یا مؤمن کس کو مانا اور سمجھا جائے؟ کیونکہ ظاہری اسلام کی بنیاد تو داخلی ایمان ہے اور وہ دل میں ہوتا ہے اور وہ دنیا میں جانچ پڑتال کے قابل (Verifiable) نہیں ہے' اسے ہم دیکھ نہیں سکتے' اس کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً حکم نہیں لگا سکتے' کوئی مفتی یا قاضی اس کے بارے میں فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اصولاً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فلاں فلاں کام ایمان کے منافی ہیں' اس کے بعد کون صحیح و سچا مومن ہے اور کون نہیں ہے اس کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہو سکتا' یہ سارے بھید آخرت میں جا کر کھلیں گے۔ تو گویا ہم کسی کے اسلام کا فیصلہ تو کر سکتے ہیں ایمان کا نہیں' کیونکہ "اسلام" ظاہری کیفیت کا نام ہے اور "ایمان" حقیقی و باطنی کی کیفیت کا نام ہے۔ لہٰذا گفتگو' تحریر و تقریر اور فتویٰ و قانونی فیصلے میں ان اصطلاحات کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔

شرعی اصطلاحات کا استعمال

قرآن حکیم میں لفظ "اسلام" کا استعمال بھی اس شان اور آن بان سے ہوا ہے کہ رشک آتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام' دونوں مل کر دعا کر رہے ہیں :

---

(۷) حدیث کے تینوں طرح کے الفاظ صحیح مسلم کتاب الایمان باب نمبر ۸' ۹' ۱۰ میں وارد ہیں۔

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾
(البقرۃ : ۱۲۸)

"اے رب ہم دونوں کو اپنا مطیع فرمان بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم (مطیع و فرمانبردار) ہو"۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا :

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (البقرۃ : ۱۳۱)

"جب اس کے رب نے اس سے کہا "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا "مسلم" ہو گیا"۔

یہاں یہ قاعدہ ذہن میں رہے کہ قرآن حکیم اور حدیث رسول ﷺ میں "ایمان" اور "اسلام" کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔ دینی اصطلاحات کے کئی جوڑے ہیں جن کے بارے میں اہل علم نے ایک اصول وضع کیا ہے : "اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اِجْتَمَعَا" یعنی ان کا اگر علیحدہ علیحدہ تذکرہ ہو گا تو ایک ہی معنی میں لئے جائیں گے اور اگر ایک ہی جگہ پر ذکر آئے گا تو ان کے معنی میں فرق ہو گا۔ نوٹ کیجئے اسلام کی داخلی کیفیت کا نام "ایمان" ہے اور ایمان کے خارجی مظہر کا نام "اسلام" ہے۔ درحقیقت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق :

Call the rose by any name it will smell as sweet

آپ گلاب کے پھول کو کوئی نام دے دیں اس کی خوشبو وہی رہے گی۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہے، عمل میں اسلام ہے، اسے آپ مومن کہہ لیں، مسلم کہہ لیں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ البتہ اس قسم کے الفاظ جہاں ایک جگہ آ رہے ہوں اور ایک دوسرے کے مقابل میں آ رہے ہوں وہاں مفہوم معین کرنا پڑتا ہے۔ سورۃ الحجرات آیت ۱۴ اس فرق کو خوب خوب واضح کر رہی ہے، فرمایا :

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

"یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی فرما دیجئے تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو ہم اسلام لے آئے ہیں (یا ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ غفور اور رحیم ہے"۔

☆ یہ بدو کون تھے؟ ـــــ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر متعدد مفسرین کا قول ہے کہ ان بدوؤں سے مراد منافقین ہیں۔ کیونکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کے پاس اسلام تو ہے' البتہ دلوں میں ایمان نہیں اور یہ تو نفاق ہی کی شکل ہے۔ بظاہر یہ رائے اور دلیل خاصی مضبوط ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ لوگ نہ مومن تھے اور نہ منافق تھے بلکہ خلا میں تھے۔ یہ رائے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور ان کے شاگرد علامہ ابن کثیر نے پیش کی ہے۔ میں بھی اسی رائے کو صحیح سمجھتا ہوں (۸) اس خلا کی حقیقت سمجھنے کے لئے یوں سمجھئے کہ مسلمان کی

---

(۸) اس حوالے سے ایک واقعہ دلچسپی کا موجب ہوگا۔ ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے' ساہیوال کی ایک مسجد میں' میں اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب معتکف تھے۔ صبح کے وقت سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ پر بات ہوئی۔ میں نے کہا اس آیت سے مراد منافق نہیں ہو سکتے' مولانا کے خیال میں اس سے مراد منافق ہی تھے' میں نے دلیل پیش کی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا﴾ جبکہ منافق کا کوئی عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے منافق ہو سکتے ہیں؟ یہ ہرگز منافق نہیں تھے۔ ابھی یہ بحث و تمحیص جاری تھی کہ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مولانا عبدالجلیل صاحب امام و خطیب جامع مسجد اہل حدیث نے امام ابن تیمیہؒ کی کتاب "الایمان" ہمیں اس پیغام کے ساتھ بھجوادی کہ آپ لوگ حالت اعتکاف میں ہیں ذرا اس کو بھی دیکھ لیں۔ جونہی میں نے کتاب کھولی تو عین وہی صفحہ نکل آیا جس میں امام ابن تیمیہ نے یہ فصل قائم کی ہے: وقد اثبت اللّٰہ فی القرآن اسلاما بلا ایمان لقولہ تعالیٰ: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا..... "اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایسا اسلام ثابت کیا ہے جس کے ساتھ ایمان نہ ہو اور مذکورۃ الصدر آیت بطور دلیل پیش کی ہے"۔ اس پر مولانا عبدالغفار صاحب نے مجھے دعائیں دیں اور فرمایا کہ تم اگر باضابطہ دینی علوم حاصل کر لو تو بہت اچھا ہے۔ تمہارے ذہن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے ساتھ بڑی مناسبت دی ہے۔ میں نے عرض کیا پڑھا دیجئے میں تیار ہوں۔

تین حالتیں ممکن ہیں۔

☆ مثبت طور پر ایمان اور اس میں درجات کا اضافہ ۱+، ۲+، ۳+، ۴+ اور بالآخر infinity یعنی لامحدود ہو جائے گا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان Infinity کے مقام پر چلا جائے گا۔

☆ منفی طور پر ایمان اور اس میں درکات (پستی کا اضافہ) ۱-، ۲-، ۳-، ۴- اور بالآخر Infinity یعنی لامحدود ہو جائے گا۔ یہ نفاق کی کیفیت ہے، عبداللہ بن ابی کا نفاق Infinity تک چلا جائے گا۔

☆ ترقی ایمان اور پستی ایمان کے درمیان لامحالہ ایک ایسا مقام آئے گا جسے میں Zero لیول سے تعبیر کرتا ہوں۔ ریاضی میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ بس یہی Zero لیول خلا کی کیفیت ہے، نہ مثبت طور پر ایمان موجود ہے اور نہ منفی طور پر نفاق ہے، بلکہ ایک خلا ہے۔

فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کی دلی کیفیت

حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دور میں جبکہ اسلام کو جزیرہ نمائے عرب میں غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور پورے عرب میں ایک روچل نکلی تھی کہ اب اسلام لے آؤ، اب مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں، اب مزاحمت کی صورت میں کامیابی کی کوئی امید نہیں، اب محمد کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور محمد (ﷺ) کا راستہ نہیں روک سکتے۔ اس لہر کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ "(اے نبی) جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور (مکہ) فتح ہو گیا اور آپ نے (لوگوں کو) دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں"۔ کہاں حضور اکرم ﷺ مکی دور میں ایک ایک فرد کے لئے جھولی پھیلا کر دعائیں مانگتے تھے: اے اللہ! عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام (ابو جہل) میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے تاکہ اسلام کو تقویت حاصل ہو۔ کہاں یہ صورت حال ہے کہ فوج در فوج اور قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہونے لگے ہیں۔ اُس وقت اسلام لانے والوں کی دلی کیفیت کو

تین حالتیں ممکن ہیں۔

☆ مثبت طور پر ایمان اور اس میں درجات کا اضافہ ۱+، ۲+، ۳+، ۴+ اور بالآخر infinity یعنی لامحدود ہو جائے گا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان Infinity کے مقام پر چلا جائے گا۔

☆ منفی طور پر ایمان اور اس میں درکات (پستی کا اضافہ) ۱-، ۲-، ۳-، ۴- اور بالآخر Infinity یعنی لامحدود ہو جائے گا۔ یہ نفاق کی کیفیت ہے، عبداللہ بن ابی کا نفاق Infinity تک چلا جائے گا۔

☆ ترقی ایمان اور پستی ایمان کے درمیان لامحالہ ایک ایسا مقام آئے گا جسے میں Zero لیول سے تعبیر کرتا ہوں۔ ریاضی میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ بس یہی Zero لیول خلا کی کیفیت ہے، نہ مثبت طور پر ایمان موجود ہے اور نہ منفی طور پر نفاق ہے، بلکہ ایک خلا ہے۔

فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کی دلی کیفیت

حضورِ اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دور میں جبکہ اسلام کو جزیرہ نمائے عرب میں غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور پورے عرب میں ایک روچل نکلی تھی کہ اب اسلام لے آؤ، اب مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں، اب مزاحمت کی صورت میں کامیابی کی کوئی امید نہیں، اب محمد کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور محمد (ﷺ) کا راستہ نہیں روک سکتے۔ اس لہر کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ "(اے نبی) جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور (مکہ) فتح ہو گیا اور آپ نے (لوگوں کو) دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں"۔ کہاں حضور اکرم ﷺ کی دور میں ایک ایک فرد کے لئے جھولی پھیلا کر دعائیں مانگتے تھے: اے اللہ! عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام (ابو جہل) میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے تاکہ اسلام کو تقویت حاصل ہو۔ کہاں یہ صورت حال ہے کہ فوج در فوج اور قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہونے لگے ہیں۔ اُس وقت اسلام لانے والوں کی دلی کیفیت کو

مندرجہ ذیل ممکنہ صورتوں میں رکھا جاسکتا ہے۔

☆ ان میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو پہلے ہی دل میں ایمان لا چکے ہوں' لیکن قبیلے کے خوف سے ابھی تک اسلام ظاہر نہ کیا ہو۔

☆ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اس وقت صدق دل سے ایمان لائے ہوں' فی الواقع ایمان ان کے دل میں داخل ہو گیا ہو۔ بہرحال سب بدو ایک جیسے نہیں تھے' اسی لئے ہم نے ترجمہ "یہ بدو کہتے ہیں" کیا ہے کیونکہ سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے کہ ان میں مومنین صادقین بھی ہیں۔

☆ یہ صورت بھی ممکن ہے کہ ان اسلام لانے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہوں جو کہتے ہوں کہ ٹھیک ہے اب تو اور کوئی چارہ کار نہیں ہے' اس وقت گردن جھکا دو' بعد میں کسی اور طریقے سے نمٹ لیں گے۔ یعنی بظاہر اسلام کا روپ' اندر نفاق کا کھوٹ۔

☆ نہ تو مثبت طور پر ایمان موجود ہے اور نہ منفی طور پر نفاق پر مبنی بدنیتی' اور نہ ہی دھوکہ دینے کا ارادہ ہے' بلکہ زمانے کی چال کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ ہے وہ خلا کی کیفیت' یعنی زیرو لیول کہ ابھی تک دل میں ایمان بھی داخل نہیں ہوا لیکن ارادے میں کوئی بدنیتی بھی نہیں ہے' اس لئے اسے نفاق بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ایک رعایت اور بشارت

سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے کہ : "اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کرے گا"۔

یہ جملہ ہمارے لئے بہت بڑی بشارت اور خوشخبری ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو ہم میں سے اکثریت کی حالت ایسی ہی ہے۔ اس وقت ایمان کی ہوا چلی تھی اور لوگ رو اروی میں ایمان لے آئے۔ اب ایمان نسل در نسل وراثتاً منتقل ہو رہا ہے یہ ہمارا کوئی ارادی انتخاب (Choice) تو نہیں ہے' ہم نے اپنے فیصلے سے تو ایمان قبول نہیں کیا' بلکہ ایمان وراثتاً چلا آرہا ہے اور ہم حادثات زمانہ کے تحت اس کے دعویدار

ہیں۔ البتہ خدانخواستہ نفاق بھی دلوں میں نہیں ہے (اِلا یہ کہ کسی کے دل میں یہ مرض موجود ہو تو اور بات ہے)۔ اکثر و بیشتر لوگ منافق نہیں اور بالارادہ وہ مومن بھی نہیں ہیں۔ آیت مذکورہ پر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حال میں بھی لوگ اطاعت کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ اس اطاعت کو قبول فرمالیں گے۔ اس پہلو سے یہ بہت بڑی بشارت ہے۔

قانون تو یہ ہونا چاہئے کہ ایمان کے بغیر کوئی اطاعت قبول نہ ہو لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے رعایت برتی ہے اور اس آیت کو "اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" پر ختم کیا ہے۔ گویا یہ اس کی شان غفاری کا صدقہ ہے یا اس کی شان رحیمی کا مظہر ہے کہ تمہارے ساتھ یہ رعایت کی جا رہی ہے کہ اگرچہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اس کے باوجود اگر تم اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری اطاعت قبول فرمالے گا۔

دو اصولی باتیں

یہاں دو اصولی باتیں نوٹ کرلیں۔ سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ خلا کی کیفیت (زیرو لیول والی کیفیت) یعنی نہ مثبت سمت میں ایمان اور نہ منفی سمت میں نفاق' یہ حالت مستقل نہیں رہ سکتی ؎

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا آدمی یا تو ایمان کی طرف پیش قدمی کرے گا یا نفاق کی طرف لڑھکے گا اور دونوں طرف جانے کے اپنے اپنے اسباب و عوامل ہوا کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں جہاں عظیم خوشخبری موجود ہے اس کے ساتھ ایک انذار و وعید بھی جمع کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اطاعت سے مراد اطاعت کلی ہے' جزوی یا اختیاری اطاعت' اطاعت شمار نہیں ہوتی بلکہ الٹا دنیا و آخرت میں قابل سزا جرم بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ

ذٰلِكَ مِنكُمْ اِلاَّ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَO ﴾ (البقرۃ : ۵۸)

"تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو"۔

البتہ بھول چوک، غلطی، نسیان، گناہ صغیرہ، گناہ کبیرہ یا اکبر الکبائر میں سے کسی گناہ کا کسی وقت سرزد ہو جانا اور بات ہے۔ وہ اصول زندگی نہیں ہوا کرتا بلکہ فریب نفس یا وسوسۂ شیطان کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس صورت میں توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُوْلٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًاO ﴾

(النساء : ۱۷)

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے"۔

لہٰذا غلط اصول زندگی اور اتفاقی غلطی کے درمیان واضح فرق رہنا چاہئے اور معاملات کا تجزیہ کرتے ہوئے یا مستقبل کے بارے میں غور کرتے ہوئے اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ غلط اصول زندگی ضلالت ہے اور ہر قسم کی غلطی، چھوٹا یا بڑا گناہ بشری کمزوری ہے، اور ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ایمان میں کمی بیشی یا جمود؟

رئیس المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں : "اَلْاِيْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ يَزِيْدُ بِالطَّاعَةِ وَيَنْقُصُ بِالْمَعْصِيَةِ" یعنی ایمان قول و عمل کا نام ہے جو کہ اطاعت سے بڑھتا ہے

اور گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔

سید الفقہاء امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : "اَلْاِیْمَانُ تَصْدِیْقٌ بِالْجَنَانِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ لَایَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ" دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کا نام ایمان ہے' جو نہ بڑھتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کی مندرجہ ذیل آیات تائید کرتی ہیں :

﴿ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ ﴾

(آل عمران : ۱۷۳)

"(جن سے لوگوں نے کہا : تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہو گئی ہیں ان سے ڈرو) تو (یہ سن کر) ان کا ایمان اور بڑھ گیا' اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے"۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ﴾ (الانفال : ۲)

"سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔"

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ ﴾

(الاحزاب : ۲۲)

"اور سچے مومنوں (کا حال اس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ "یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی"۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔"

﴿ وَاِذَا مَا اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ

كَافِرُوْنَ ۝ (التوبہ : ۱۲۴ - ۱۲۵)

"جب کوئی نئی سورۃ نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پوچھتے ہیں کہ "کہو تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟" جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورۃ نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دلشاد ہیں' البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق) کا روگ لگا ہوا ہے ان کی سابق نجاست پر (ہر نئی سورۃ نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا۔ اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے۔"

مذکورہ بالا آیات میں بصراحت اضافۂ ایمان کا تذکرہ آیا ہے۔ نیز کچھ احادیث میں ایمان میں کمی کا ذکر بھی وارد ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا :

((اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِيْ قَلْبِهٖ' فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهٗ فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى يَعْلُوَ قَلْبَهٗ فَذٰلِكَ الرَّانُ الَّذِيْ قَالَ جَلَّ ثَنَاءُهٗ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝)) (۹)

"جب مومن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے' اگر توبہ استغفار کر لے اور گناہ سے باز آ جائے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے' لیکن اگر گناہوں میں آگے بڑھتا چلا جائے تو یہ سیاہ دھبہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے سارے دل کو کالا کر دیتا ہے اور یہی وہ "ران" (زنگ اور میل کچیل) جس کا اللہ تعالیٰ نے (سورۃ المطففین آیت ۱۴ میں) تذکرہ کیا ہے : "ہرگز نہیں بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔"

چونکہ گناہ دل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایمان کو کمزور کرتے ہیں اس لئے علماء نے کہا ہے "المعاصی برید الکفر" کہ گناہ کفر کی ڈاک ہے' یعنی معصیت سے کفر کے

---

(۹) مسند احمد ۲/۲۹۷ ح ۷۹۳۹ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ سنن الترمذی کتاب التفسیر باب من تفسیر سورۃ ویل للمطففین المستدرک للحاکم ۲/۵۱۷ امام حاکم' امام الذہبی' امام ترمذی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ غلط اعمال کا انسانی کردار پر اثر سمجھنے کے لئے "کبیرہ گناہوں کی حقیقت" ص ۳۵ تا ص ۹۴ کا مطالعہ از حد مفید ثابت ہوگا۔

پیغامات اور ہوائیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے گا تو پہلے ایمان کمزور ہو گا اور بالآخر ختم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے جب ایمان نہیں رہے گا تو کفر ڈیرے ڈال لے گا۔ اور یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔

البتہ سید الفقہاء [۱۰] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایمان ــــ بمعنی ایمان ظاہری یعنی اسلام ــــ جامد ہے، نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے، اور اسی ایمان کے ذریعے انسان کو اسلامی معاشرے یا اسلامی ریاست میں قانونی (Legal) اور دستوری (Constitutional) مقام (Status) حاصل ہوتا ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے معاشرے میں اس کے حقوق متعین ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں اس کے حقوق سب مسلمانوں کے لئے برابر ہیں۔ قانونی طور پر سب مسلمان برابر ہیں لہٰذا قانونی سطح پر اسلام بالکل مساوی ہے۔

مثال : بالفرض اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا کامل الایمان اور عبد اللہ بن اُبی جیسا آخری درجے کا منافق ایک ہی والد کے بیٹے ہوتے تو ان کو وراثت میں حصہ برابر ملتا، ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ایمان کی وجہ سے زیادہ نہ ملتا اور عبد اللہ بن ابی کو نفاق کی وجہ سے کم نہ ملتا۔ یہ محض ایمان کا قانونی پہلو ہے، حقیقی نہیں۔ عصر حاضر کی اصطلاحات کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست میں تمام مسلمان شہریوں کے حقوق برابر ہیں، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے : "اَلْمُسْلِمُ کُفْوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ" [۱۱] ہر مسلمان دوسرے کے برابر ہے۔ تمام مسلمانوں کے

---

(۱۰) مجھ پر امام ابو حنیفہؒ کی عظمت یہاں منکشف ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انہیں بار بار سید الفقہاء کہہ رہا ہوں اور دل کی گہرائی سے ان کی عظمت کا معترف ہوں۔ میرا یہ اذعان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو قانون و دستور کا جس قدر فہم دیا تھا میرے علم کی حد تک کسی کو نہیں دیا گیا، قانون اور دستور کا ایک خاص sense ہوتا ہے جسے حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ چونکہ آپ فقیہ تھے اس لئے آپ کی نگاہ معاملات کے قانونی پہلو پر رہتی تھی۔ (ماخوذ)

(۱۱) اور اس قاعدے کی بنیاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے : المسلمون یدٌ علی من سواھم تکافا دمائھم [مسند احمد ۲/ ۱۸۰ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے ملاحظہ ہو شرح احمد شاکر ح ۶۶۹۲]
"تمام مسلمان کافروں کے مقابلے میں ایک طاقت ہیں اور ان کے آپس میں خون برابر ہیں"
(اضافہ از مرتب)

قانونی و دستوری حقوق (Legal and Constitutional rights) برابر ہیں۔ یعنی ایمان کا قانونی پہلو جسے ہم اسلام سے تعبیر کرتے ہیں' اس سطح پر سب مسلمان برابر ہیں۔ البتہ حقیقی ایمان جو باطن میں ہے اس کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے' جبکہ قرآن حکیم میں متعدد صریح آیات پکار پکار کر اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہر شخص کا ذاتی تجربہ شاہد ہے کہ ایمان گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے۔ قرآن حکیم کو سوچ سمجھ کر پڑھئے' ذکر کیجئے' اہل یقین کی صحبت میں بیٹھئے' خود بخود محسوس ہو گا کہ اندر کوئی احساس ترقی کر رہا ہے۔ اس کے بالمقابل غافلوں کی محفل میں بیٹھئے' ٹھٹھے لگائیے' فحش گوئی کیجئے' حرام خوری کیجئے' خود بخود محسوس ہو گا کہ اندر سے کوئی چیز برف کی طرح پگھل پگھل کر کم ہو رہی ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ ایمان کا قانونی پہلو (جو کہ اسلام کہلاتا ہے) کم و بیش نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل حقیقی ایمان' جو یقین قلبی سے عبارت ہے' کم و بیش ہوتا رہتا ہے اور ہر انسان پر دن میں کئی مرتبہ یہ کمی بیشی وارد ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حقیقی ایمان کو سامنے رکھا اور فرمایا "اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَ عَمَلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ" اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قانونی ایمان کو سامنے رکھا اور فرمایا : "اَلْاِیْمَانُ تَصْدِیْقٌ وَّقَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ" اس ظاہری تضاد اور بُعد المشرقین کے باوجود دونوں حضرات سو فیصد صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ ایک حقیقی ایمان اور دوسرا قانونی ایمان کی بات کر رہا ہے۔ اس لئے کہ دونوں کے میدان' اصول اور نتائج جدا جدا ہیں۔

ایمان اور جہاد

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾

(الحجرات : ۱۵)

"حقیقت میں مؤمن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر

انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' وہی سچے لوگ ہیں۔"

سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں ایمان اور اسلام کو علیحدہ کر دینے کے بعد آیت ۱۵ میں ایمان کو واضح اور معین طور پر (define) کر دیا گیا۔ ذرا غور کریں کہ ابتداء میں "اِنَّمَا" (صرف وہ آدمی جس میں مطلوبہ خوبیاں پائی جائیں) اور آخر میں "اُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ" (صرف یہی لوگ سچے ہیں) کا اسلوبِ حصر لگا کر تعریف کو جامع و مانع کر دیا گیا۔

حصر کیا ہے؟ عام زبان میں ہم کہیں گے "زید عالم ہے" اس کا معنی یہ ہوا کہ زید ضرور عالم ہے لیکن دوسرے لوگ بھی عالم ہو سکتے ہیں۔ البتہ جب ہم کہیں : "صرف زید ہی عالم ہے" تو معلوم ہوا کہ زید عالم ہے اور دوسرا کوئی عالم نہیں ہے۔ اس طرح علم کی صفت صرف زید کے لئے ثابت ہوئی اور دوسروں سے اس کی نفی ہو گئی۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ شرائط بھی پوری کریں :

۱۔ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (دعویٰ ایمان کے بعد کسی شک میں مبتلا نہ ہوں) یقین کی تعبیر کے لئے اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی لفظ ممکن نہ تھا' بلکہ اگر صرف مثبت یقین کا لفظ آتا تو یہ زور پیدا نہ ہوتا جو "ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا" کے الفاظ سے پیدا ہوا ہے۔

۲۔ وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اور اپنے مالوں اور جانوں کو کھپا کر اللہ کی راہ میں جہاد کریں)۔

اس طرح ایمان حقیقی کے لئے دو شرطیں لازم قرار دے دی گئیں (دل میں غیر متزلزل یقین اور عمل میں مالی و جانی جہاد)۔ شروع کی طرح آخر میں پھر اسلوبِ حصر لایا گیا' فرمایا : "اُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ" صرف یہ شرطیں پوری کرنے والے افراد ہی اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

جس طرح پرکار کے دو سرے بند ہو کر ایک نقطہ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اسی طرح اس آیت کریمہ میں دو چیزیں اکٹھی بیان کر دی گئیں۔ جبکہ سورۃ الانفال میں پرکار کے

دونوں بازو کھول دیئے گئے۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ○ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ○ ﴾ (الانفال : ۲ - ۴)

"سچے اہل ایمان تو بس وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں' ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں' خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔

سورۃ الانفال کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ○ ﴾ (الانفال : ۷۴)

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں' ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔

سورۃ الحجرات میں جو پر کار بند تھی اس کو جب کھولا گیا تو ایک بازو سورۃ الانفال کے شروع میں آیا اور دوسرا آخر میں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جہاد ایمان حقیقی کا رکن لازم ہے۔ اور اسے یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ جہاد ایمان کا لازمی نتیجہ ہے' اگر ایمان حقیقی موجود ہے تو جہاد لازماً ہو گا' کیونکہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ اسلام کی تعریف کے فوراً بعد آئی ہے اور پھر اول و آخر الفاظ حصر کو لا کر واضح کر دیا گیا ہے کہ ایمان کی جامع و مانع تعریف یہی ہے کہ دل میں غیر متزلزل یقین اور عمل میں جان و مال سے جہاد۔

چونکہ ایمان حقیقی کے اثرات آخرت میں ظاہر ہوں گے لہٰذا اخروی نجات کے لئے جو بات بطور شرط اور لازمی اصول کے بیان کرنی تھی وہ سورۃ الصف کی اس آیت میں بیان کردی گئی' فرمایا :

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ ﴾ (الصف : ۱۰ - ۱۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذابِ الیم سے بچادے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو"۔

ذرا غور کریں کہ جنت کا وعدہ یا داخلہ تو بعد کی چیز ہے پہلے عذاب سے چھٹکارا پانا ضروری ہے جس کے لئے دو لازمی شرطیں بیان کی گئی ہیں :

ا : اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔

ب : جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام عام ہے اور ایمان خاص ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان ہیں : شہادتِ توحید و رسالت' نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج۔ اب شہادت توحید و رسالت سے پہلے یقین قلبی اور حج کے بعد جہاد کا اضافہ کرلیں تو ایمان بن جاتا ہے۔

جوش و جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر بعض لوگوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو اسلام کا رکن قرار دے دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی غلطی بلکہ جسارت ہے' کیونکہ حدیث جبریل میں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی معروف روایت "بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ..... "الخ" میں اسلام کے پانچ ہی ارکان بیان ہوئے ہیں۔ اتنی واضح نصوص کے ہوتے ہوئے ارکان اسلام میں جہاد یا کسی اور کام کا اضافہ کرنا اپنے آپ کو حکمت نبویؐ سے بالاتر ثابت کرنا ہے ـــــــ والعیاذ باللہ

جہاد کے بارے میں مغالطے اور وضاحتیں

جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو چند در چند مغالطے لاحق ہیں۔ گویا ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کے مصداق گمراہی پر گمراہی یا کم سے کم غلطی پر غلطی کا معاملہ ضرور ہے۔

پہلا مغالطہ : پہلا مغالطہ بالعموم یہ ہے کہ جہاد کا معنی جنگ اور قتال ہے۔

وضاحت : اس مغالطے کی بنیاد ہی غلط ہے اس لئے کہ جہاد اور قتال قرآن حکیم کی دو الگ اصطلاحیں ہیں۔ اگرچہ ان کا معاملہ بھی اسلام و ایمان کی طرح ہے کہ اگر ایک بیان ہو تو دوسرے کے معنی لئے جا سکتے ہیں اور اگر دونوں اکٹھے بیان ہوں تو ان کے علیحدہ علیحدہ معنی معین کرنے پڑتے ہیں' جیسا کہ قاعدہ گزرا ہے : "اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اِجْتَمَعَا" یعنی جب وہ دونوں اکٹھے ہوں تو مفہوم علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور جب علیحدہ علیحدہ بیان ہوں تو معنی ایک ہی ہوتا ہے۔ البتہ جہاد کے معنی لازماً جنگ کے نہیں ہوتے۔ اسی غلطی اور مغالطے کی وجہ سے بہت ساری چیزیں ذہنوں میں الجھی ہوئی ہیں۔

دوسرا مغالطہ : جنگ تو ہر وقت نہیں ہوتی لہٰذا ہم کس طرح ہر وقت جہاد میں شریک ہو سکتے ہیں۔

وضاحت : یہ مغالطہ بھی سابقہ مغالطے کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہے' ورنہ جنگ تو واقعتاً کبھی کبھی ہوتی ہے اور سلسلۂ جہاد ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

تیسرا مغالطہ : خاص حالات کے علاوہ تو جنگ فرض کفایہ ہے' لہٰذا اگر مجاہدین کی اتنی تعداد میسر آ جائے کہ مطلوبہ ضرورت پوری ہو جائے تو باقی لوگوں پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔

وضاحت : یہ مغالطہ بھی اس لئے پیدا ہوا کہ جنگ اور جہاد کو ایک ہی کام سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دونوں میں وسیع و عریض فرق ہے۔

چوتھا مغالطہ : مسلمان جب بھی جنگ کرتا ہے تو وہ جہاد فی سبیل اللہ شمار ہوتا ہے۔

وضاحت : ایک مسلمان' مسلمان ہونے کے باوجود ظالم وفاسق بھی ہو سکتا ہے۔ مسلمان اپنے غلبے اور اپنے ملک کی توسیع کے لئے بھی جنگ کرلیتا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ یہ سارے غلط کام "جہاد فی سبیل اللہ" شمار ہوں۔ بلکہ یہ سارے کام فساد فی الارض کے زمرے میں آتے ہیں۔ صحیح اسلامی جہاد کی وضاحت حدیث میں اس طرح بیان ہوتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صلَّى اللّٰه عليه وسلم فَقَالَ : الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلمَغْنَمَ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرِىَ مَكَانُهُ فَمَنْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ : مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (۱۲)

"ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اس نے دریافت کیا : ایک آدمی مال غنیمت کی نیت سے جنگ میں شریک ہوتا ہے' دوسرا آدمی اپنا نام پیدا کرنے کے لئے آتا ہے' تیسرا آدمی اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہنچتا ہے' ان میں سے کون اللہ کی راہ میں شمار ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا : جو آدمی اس لئے لڑے کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو جائے بس وہی اللہ کے راستے میں شمار ہوگا۔"

پانچواں مغالطہ : ایک زمانے تک تو مرنے مارنے اور قتل کی ضرورت تھی' فی زمانہ اس کی ضرورت نہیں' بس دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تزکیہ ہی کافی ہے ـــــ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسی باتیں بعض نادان علماء سے منسوب ہو کر پہنچ رہی ہیں۔

وضاحت : یہ مغالطہ کس قدر بے بنیاد ہے' اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حدیث سے ہو جاتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا :

---

(۱۲) صحیح البخاری کتاب الجهاد باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا ح ۲۶۵۵ و صحیح مسلم کتاب الامارہ باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا ح ۱۹۰۴ و کتب السنن و دیگر کتب حدیث میں یہ روایت تھوڑے لفظی اختلاف و اضافے کے ساتھ موجود ہے' ملاحظہ ہو جامع الاصول ۵۸۱/۲ ح نمبر ۱۰۶۳

((ثَلاَثَةٌ مِنْ اَصْلِ الایْمَانِ : اَلْکَفُّ عَمَّنْ قَالَ : لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَلاَ نُکَفِّرُهُ بِذَنْبٍ وَلاَ نُخْرِجُهُ مِنَ الْاِسْلاَمِ بِعَمَلٍ ' وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰهُ اِلٰی اَنْ یُّقَاتِلَ آخِرُ هٰذِهِ الامَّةِ الدَّجَّالَ ' لاَ یُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلاَ عَدْلُ عَادِلٍ وَّالایْمَانُ بِالْاَقْدَارِ)) (۱۳)

" تین چیزیں ایمان کی جڑ اور بنیاد ہیں : (۱) جو کوئی لا الٰہ الا اللہ کہتا ہو اس سے (زبان اور ہاتھ کو) روک لینا' کسی گناہ کی وجہ سے ہم اس کو کافر نہیں کہیں گے' اور نہ ہی کسی کام کی وجہ سے اسے اسلام سے خارج کریں گے۔ (۲) جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی بنا کر مبعوث کیا ہے جہاد اس وقت سے جاری ہے اور اس وقت تک (جاری رہے گا) جب اس امت کا آخری فرد دجال سے جنگ کرلے' نہ کسی ظالم کا ظلم اس کو ختم کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی عادل کا عدل (۳) اور ہر قسم کی تقدیر پر ایمان لانا"۔

(جاری ہے)

---

(۱۳) سنن ابی داؤد کتاب الجهاد باب فی الغزو مع ائمة الجور ح ۲۵۳۲ والسنن الکبریٰ للبیهقی ۱۵۶/۹ کتاب السیر باب الغزو مع ائمہ الجور۔ اس روایت میں یزید بن ابی نشبہ راوی غیر معروف ہے لہٰذا علماء نے حدیث کو ضعیف کہا ہے' ملاحظہ ہو جامع الاصول ۲۴۲/۱ ح نمبر ۳۲۔

کون مسلمان ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ نہ ہو!
لیکن آپؐ اور آپؐ کے لائے ہوئے دین سے سچی محبت کے تقاضے کیا ہیں'
ہم میں اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں!

اس موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد کی نہایت جامع تالیف

حُبِّ رسولؐ اور اُس کے تقاضے

خود بھی مطالعہ کیجئے اور دوسروں تک بھی پہنچائیے!

صفحات ۳۲ ● قیمت -/۶ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

درس ۱۲

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

(۳)

عورت کا روحانی و اخلاقی تشخص

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝ ﴾ (آیات ۱۰-۱۲)

"اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کافروں کے لئے نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کی۔ وہ دونوں ہمارے دو نہایت نیک بندوں کے عقد میں تھیں' تو انہوں نے ان سے خیانت کی روش اختیار کی' تو وہ دونوں ان (اپنی بیویوں) کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے' اور یہ کہہ دیا گیا (ان بیویوں سے) کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی اہل ایمان کے لئے فرعون کی بیوی کی۔ جبکہ اس نے کہا اے میرے رب!

میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے نجات بخش ظالموں کی قوم سے ـــــ اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال بیان فرمائی جس نے اپنی عصمت کی پوری حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اس نے تصدیق کی اپنے رب کی تمام باتوں کی اور اس کی کتابوں کی اور وہ ہمارے بہت ہی فرماں بردار بندوں میں سے تھی"۔

یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ التحریم میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل یعنی مرد اور عورت کے مابین رشتۂ ازدواج کہ جس سے خاندان کے ادارہ کی بنیاد پڑتی ہے' کے ضمن میں نہایت اہم اور بنیادی ہدایات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ عائلی زندگی کے بارے میں ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے! آپ کو معلوم ہے کہ اس ضمن میں دنیا میں بہت افراط و تفریط رہی ہے۔ عورت کو یا تو بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک ملکیت قرار دیا گیا' ہمارے ہاں بول چال کے عام محاورے میں اسے جوتی کی نوک سے تعبیر کیا گیا' یا پھر اسے بازار میں لا بٹھایا گیا۔ اور کبھی اسے قلوپطرہ کا روپ دھار کر قوموں کی قسمتوں سے کھیلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ یہ افراط و تفریط ہے جس میں نوع انسانی بالعموم مبتلا رہی ہے۔ اسلام نے عورت کو ایک مکمل قانونی اور اخلاقی تشخص عطا کیا' پھر اس کے دائرہ عمل اور میدانِ کار کا تعین کیا۔ اسلام کی رو سے عورت کا ایک علیحدہ قانونی وجود ہے۔ چنانچہ اس کے قانونی حقوق ہیں۔ عورت کی اپنی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور وہ اپنی اس ملکیت میں تصرف کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ لہٰذا عام انسانی حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں نہایت قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو قانونی تشخص دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تشخص بھی عطا کیا ہے۔ عورت اگر کوئی نیک کام کرتی ہے تو اس کا اجر و ثواب اس کے لئے ہے۔ وہ اس معاملے میں مَردوں کے تابع نہیں ہے۔ چنانچہ شوہر اپنی بیوی کے نان و نفقہ کا کفیل اور ذمہ دار تو ہے' لیکن اس کے دین و اخلاق کا کفیل اور ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر عورت میں نیکی اور بھلائی ہو گی تو وہ اس کے لئے ہے' عورت کوئی خیر کمائے گی تو اس کا صلہ اور اجر و ثواب اسی کو ملے گا۔ اسی طرح اگر مَرد

کوئی نیکی کماتا ہے تو اس کا اجر و ثواب اسی کے لئے ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ اصل الاصول بیان کیا ہے کہ ﴿ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴾ "کسی انسان کے لئے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کے لئے اس نے محنت کی ہے" جس کے لئے اس نے مشقت اور بھاگ دوڑ کی ہے۔

پھر یہ کہ انسان ہونے کے ناطے سے مَرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۵ میں فرمایا گیا ﴿ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ ﴾ "میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ وہ (عمل کرنے والا) مَرد ہو یا عورت ہو۔ تم ایک دوسرے ہی سے ہو" یعنی مَرد و عورت کا فرق و تفاوت خواہ جسمانی ہو' خواہ نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے ہو' یہ فرق تو ہم نے تمدنی ضروریات کے تحت رکھا ہے' باقی انسان ہونے کے اعتبار سے تم ایک دوسرے ہی سے ہو۔

یہی اصول قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں نہایت واضح شکل میں سامنے آتا ہے ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ﴾ "مَردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی"۔ یعنی جو بھلائیاں' نیکیاں' خیرات اور حسنات مَردوں نے اپنی محنت اور مشقت سے کمائی ہیں' ان کا اجر و ثواب ان کے لئے ہے اور جو بھلائیاں اور نیکیاں عورتوں نے کمائی ہیں' ان کا اجر و ثواب ان کے لئے ہے۔ اسی طرح جو برائی اور بدی مَرد کمائے گا اس کا وبال اس پر ہو گا اور جو بدی اور برائی عورت کمائے گی اس کی پاداش اس کو بھگتنی ہو گی۔

اس اصول کو سورۂ تحریم کی آخری تین آیات میں تین مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ خواتین کہیں اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ ان کے شوہران کے دین و اخلاق کے بھی کفیل ہیں اور وہ دین و اخلاق کے معاملہ میں مَردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ پہلی مثال دو ایسی عورتوں کی پیش کی گئی جن کے شوہر اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر رسول تھے' ایک حضرت نوح اور دوسرے حضرت لوط علیہما السلام۔ ان دونوں کی بیویوں کا ذکر کیا گیا کہ دین کے اعتبار

سے ان کا معاملہ درست نہ تھا۔ انہوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ بیوفائی کی تھی ـــــ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ ان سے لازمی طور پر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ اپنے شوہروں کے رازوں کا افشا بھی ایک خیانت اور بیوفائی کا عمل ہے۔ اس لئے کہ اسی سورۃ النساء میں جہاں آیت ۳۴ میں یہ اصل الاصول بیان کیا گیا کہ ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ﴾ یعنی مرد عورتوں پر نگران اور حاکم ہیں' وہاں ایک مثالی (IDEAL) بیوی کے یہ اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں کہ ﴿ اَلصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ ﴾ "نیک بیویاں وہ ہیں جو فرمانبرداری کی روش اختیار کریں (اپنے شوہروں کا کہنا مانیں اور ان کے) رازوں کی پوری حفاظت کریں"۔ ظاہر بات ہے کہ بیوی سے زیادہ مرد کا رازدار اور کون ہو گا! مرد میں اگر کوئی خامی ہے' اگر کسی پہلو سے اس میں کوئی پوشیدہ جسمانی عیب ہے تو اسے اس کی بیوی سے بڑھ کر جاننے والا اور کوئی نہیں۔ گویا مرد کی پوری شخصیت عورت کے پاس بطور امانت ہے۔ راز کو بھی امانت کہا گیا ہے۔ لہٰذا اگر شوہر نے کوئی راز کی بات بیوی کو بتائی ہو اور بیوی اس راز کو افشا کر دے تو یہ بھی خیانت ہے۔ چنانچہ "فَخَانَتٰهُمَا" کے لفظ سے یہ لازمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ان دونوں جلیل القدر رسولوں کی بیویاں بدچلن اور بدکار تھیں (معاذ اللہ)۔ قرآن مجید کے اصول کو اگر پیش نظر رکھیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کسی رسول کے حبالۂ عقد میں کوئی بدچلن اور بدکار عورت ہو ـــــ لہٰذا ان خواتین کا یہ طرزِ عمل کہ وہ درپردہ اپنی کافر قوموں کے ساتھ تھیں اور ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ تھیں' اسے یہاں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن یہاں جو اصل بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں عورتیں ہمارے رسولوں کے حبالۂ عقد میں تھیں لیکن چونکہ ان دونوں کے اپنے اعمال درست نہ تھے لہٰذا ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہو گا اور رسول کی زوجیت میں ہونا انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ چنانچہ ان سے کہہ دیا گیا کہ "دوزخ میں داخل ہو جاؤ دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ" ﴿ وَقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ﴾ یہاں "قِیْلَ" فعل ماضی مجہول ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قیامت کے حالات کا ذکر ہوتا ہے وہاں عام طور پر فعل

ماضی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے کہ فعل ماضی میں قطعیت و حتمیت ہوتی ہے کہ کوئی کام ہو چکا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی یقینی بات وہ ہوتی ہے جو وقوع پذیر ہو چکی ہو اتنی ہی یقینی بات قیامت و آخرت کی ہے۔ لہٰذا آخرت کے احوال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید عام طور پر ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے' ہو سکتا ہے کہ اس میں عالم برزخ میں یہ بات کہی جانے کی طرف اشارہ ہو رہا ہو' واللہ اعلم بالصواب' لیکن یہاں جس حقیقت کی جانب نشاندہی مقصود ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث کے حوالے سے بھی ہمارے سامنے آچکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی لخت جگر' نورِ نظر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا تھا کہ اے فاطمہ! محمد (ﷺ) کی بیٹی! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ' اس لئے کہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے یہاں کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا ـــــ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ حضرت نوح اور حضرت لوط (علیہما السلام) جیسے جلیل القدر پیغمبر آخرت میں اپنی بیویوں کے کام نہ آسکیں گے۔ یہ مثال بیان ہوئی ان دو عورتوں کی جو دو بہترین شوہروں کے حبالۂ عقد میں تھیں' لیکن چونکہ وہ خود اہل ایمان میں سے نہ تھیں لہٰذا ان کے شوہروں کی نیکی اور بزرگی انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔

اب اس کے برعکس ایک مثال ایک بدترین شخص کے نکاح میں ایک نہایت نیک اور صالحہ خاتون کی آ رہی ہے۔ فرعون جیسے سرکش و متمرد' اللہ کے باغی اور خدائی کے مدعی شخص کے عقد میں حضرت آسیہ تھیں۔ اغلباً یہ وہی خاتون ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں بہتے ہوئے صندوق سے نکالا تھا اور فرعون کو آمادہ کر لیا تھا کہ ان کی پرورش وہ خود کریں گی۔ وہ یقیناً بنی اسرائیل کی کوئی مؤمنہ و صالحہ خاتون تھیں جو فرعون کی بیوی تھیں۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ فرعون کا محل اور وہاں کی آسائشیں اور سہولتیں نیز وہاں کا آرام گویا ان کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ شوہر کی ضلالت' اس کی گمراہی و بے راہ روی اور اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ عیش و آرام' جو شاہی محل کا جزو لاینفک ہوتا ہے' ان پر دوبھر تھا۔ چنانچہ ان کی دعا قرآن نے بایں الفاظ نقل کی ہے کہ ﴿ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی پروردگار مجھے جلد سے جلد فرعون سے' اس

کے عمل سے اور ظالم و مشرک قوم سے نجات دے کر اپنے پاس بلا اور اپنے جوارِ رحمت یعنی جنت میں میرے لئے گھر بنا۔ اس دوسری مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر خواہ کتنا ہی بدکردار یا کافر و مشرک ہو' اگر وہ عورت خود مومنہ اور صالحہ ہے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ شوہر کی برائی اسے کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اب اس ضمن میں تیسری مثال ایک ایسی خاتون کی آ رہی ہے کہ جنہیں ماحول بھی بہترین ملا اور پھر جن کے خود اپنے اندر بھی نیکی بھلائی اور حسنات کے بہترین رجحانات اور میلانات بکمال و تمام موجود تھے۔ گویا وہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کی مثال ہیں ـــــ پہلی مثال بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی تھی۔ دوسری مثال اس کے برعکس ایک بدترین شوہر کے عقد میں ایک بہترین خاتون کی تھی ـــــ اور اب تیسری مثال حضرت مریم سلامٌ علیہا کی آ رہی ہے' جو خود بھی نہایت نیک' صالحہ اور عبادت گزار تھیں۔ پھر ان کی والدہ بھی اس قدر نیک تھیں کہ انہوں نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی اپنی ہونے والی اولاد کو اللہ کی نذر کر دیا تھا جس کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۳۵ میں بایں الفاظ آیا ہے ﴿ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا ﴾ "اے میرے رب! میں نے تیرے لئے نذر کیا جو کچھ میرے پیٹ میں ہے' دنیا کے تمام بکھیڑوں سے اسے چھٹکارا دلاتے ہوئے"۔ یعنی میں اس کو صرف تیرے دین کی خدمت کے لئے وقف کرنے کا عہد کرتی ہوں۔ تو یہ خاتون ہیں جن کی آغوش میں حضرت مریم نے پرورش پائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کا مربی اور کفیل بنایا جو اللہ کے جلیل القدر نبی اور ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کے مجاور اور نگران بھی تھے اور رشتے میں حضرت مریم کے خالو تھے۔ تو گویا یہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کا معاملہ ہے۔ ایک طرف حضرت مریم کی سیرت اور ان کا کردار ہے جس کی اللہ تعالیٰ مدح فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی عصمت و عفت کی کامل طور پر حفاظت کی۔ پھر امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑی آزمائش سے دوچار فرمایا۔ ایک نوجوان خاتون جو ناکتخدا ہو' جس کی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ حاملہ ہو جائے' آپ خود سوچئے کہ معاشرہ میں کیسی رسوائی کا سامان ہے جو ان کے لئے فراہم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس شدید آزمائش میں مبتلا کیا۔ لیکن اس اللہ کی بندی نے اپنے رب کے ہر حکم کے سامنے سرِ

تسلیم خم کیا ﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ ﴾ یہ ان کی زندگی کا نقشہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے تمام احکام کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے تمام آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علومِ دینیہ سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ آیت کے آخر میں ان کی مدح ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی گئی ﴿ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴾ وہ اللہ کے فرماں برداروں میں سے ایک بندی تھی۔

غور کیجئے کہ یہاں تین مثالوں کے ذریعے تین ممکنہ صورتوں کو بیان کر دیا گیا' لیکن ایک امکان ابھی باقی ہے۔ گویا اس عمارت کا ایک کونا ابھی خالی ہے۔ بہترین شوہروں کے ہاں بدترین عورتوں کی مثال حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویاں ہیں' بدترین شوہر کے ہاں بہترین خاتون کی مثال حضرت آسیہ ہیں' جبکہ بہترین ماحول میں بہترین خاتون کی مثال حضرت مریم ہیں۔ اب ایک مثال رہ جاتی ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی۔ گویا ﴿ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ﴾ کا نقشہ ہو۔ جسے ہم اپنے محاورہ میں کہتے ہیں کہ کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ اس کی مثال ہمیں قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ملتی ہے اور وہ ہے سورۃ اللھب۔ اس سورۂ مبارکہ میں ابولہب اور اس کی بیوی دونوں کا ذکر ہے :

﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ○ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ○ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ○ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ○ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ○ ﴾

اس سورۂ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے چچا ابولہب اور آپؐ کی چچی (ابولہب کی بیوی) اُم جمیل کی آنحضور ﷺ سے عداوت کا بیان ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو نبی اکرم ﷺ سے زیادہ عداوت' بغض اور دشمنی تھی۔ کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آنحضورؐ کی دشمنی' عداوت اور ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ تو سورۃ اللھب میں بدترین شوہر اور بدترین بیوی کی مثال موجود ہے۔ اس طرح یہ کونہ اور گوشہ بھی پُر ہو جاتا ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی بدترین ہو تو اس کی صورت کیا ہو گی۔ چنانچہ ان کے بارے میں اسی دنیا میں جہنم کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اب ان چاروں مثالوں کو سامنے رکھ کر جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ عورت کا اپنا ایک

ذاتی تشخص ہے۔ اس معاملہ میں عورت لازماً اپنے شوہر کے تابع نہیں ہے۔ وہ دینی و اخلاقی طور پر ایک آزادانہ تشخص کی مالک ہے۔ اس کے اندر اگر بھلائی' نیکی اور خیر ہے تو وہ اسی کے لئے ہے' لیکن برائی' بدی اور سرکشی ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا۔ چونکہ اسلام کے عائلی نظام میں مالی اعتبار سے شوہر بیوی کا کفیل ہوتا ہے لہٰذا ہمارے ہاں بعض خواتین کو غیر شعوری طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ شاید نیک کام کرنا' بھلائیاں کمانا اور دین کی خدمت کرنا' یہ صرف مَردوں کے کرنے کا کام ہے۔ اور مَرد اگر یہ کام کرلیں تو عورتوں کے لئے کفایت کرے گا۔ اس مغالطہ کی ان آیات مبارکہ کی روشنی میں مکمل اصلاح ہو جانی چاہئے۔ اس کے لئے میں پھر وہی الفاظ دوہرا رہا ہوں جو سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں آئے کہ ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

- ایک مسلمان کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
- دعوت و تبلیغ اور غلبہ دین کی جدوجہد اضافی نیکی کے کام ہیں

یا بنیادی فرائض میں شامل ہیں؟

ان موضوعات پر ایک مختصر لیکن نہایت جامع کتابچہ

دینی فرائض کا جامع تصوّر

از: ڈاکٹر اسرار احمد

عمدہ کمپیوٹر کتابت ● صفحات ۴۰ ● قیمت: اشاعت خاص ۸/- ، اشاعت عام ۴/-

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن' ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

کتابتِ مصاحف اور عِلمِ ضبط (۲)

علاماتِ ضبط کی ابتداء، ان کے متنوع ارتقاء اور ان کے زمانی اور مکانی ممیّزات کا اجمالی جائزہ

——— پروفیسر حافظ احمد یارؒ ———

۱۰۔ باتفاقِ روایات ابو الاسود الدؤلی تابعین میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم نحو کی بنیاد ڈالی اور ساتھ ہی قرآن مجید میں نقطوں کے ذریعے شکل (حرفوں کی آواز کو علامات کے ذریعے متعین کرنا) کے ایک نظام کی ابتداء کی[۱۷] ابو الاسود کے اس کام پر آمادہ ہونے کے محرکات کی مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کا باعث ان کا عبید اللہ بن زیاد کا اتالیق ہونا بنا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ایک موقع پر انہوں نے خود اپنی بیٹی کو غلط عربی بولتے سنا۔ تیسری وجہ یہ ہوئی کہ کسی عدالت میں مدعی نے اپنا کیس بالکل غلط عربی میں پیش کیا۔ چوتھی اور مشہور روایت، جس کا تعلق بھی براہ راست قرآن سے ہے، یہ ہے کہ انہوں نے کسی آدمی کو سورۃ التوبہ کی تیسری آیت میں لفظ "وَرَسُوْلُهٗ" جر کے ساتھ (وَرَسُوْلِهٖ) پڑھتے سنا[۱۸] ممکن ہے یہ ساری وجوہ ہی درست ہوں، جن کی بنا پر ابو الاسود نے نحو کے کچھ قواعد بھی مرتب کرنے کی ابتداء کی۔ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے تیس آدمیوں کا انٹرویو لینے کے بعد ایک نہایت درست لہجے اور صاف تلفظ والے سمجھدار پڑھے لکھے آدمی کا انتخاب کیا[۱۹] ایک مصحف دے کر اسے اپنے سامنے بٹھایا اور خود آہستہ آہستہ قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ شخص مذکور کو الفاظ کے تلفظ کے وقت قاری کے منہ، ہونٹوں اور زبان کی حرکات کے لئے حروف پر مختلف جگہ پر سرخ سیاہی سے ایک خاص انداز میں نقطے لگانے کی ہدایت کی۔ ایک دن یا ایک مجلس میں کئے ہوئے کام پر وہ خود نظرثانی کرتے تھے، یہاں تک کہ پورے قرآن مجید پر "نقاطِ شکل" لگانے کا کام مکمل

ہو گیا۔[۲۰]

☆ ابوالاسود کے کام کا خلاصہ یہ ہے کہ :

۱۔ انہوں نے حرفوں کی آواز (حرکت) کو نقطوں سے ظاہر کیا۔

۲۔ یہ نقطے قرآن کی کتابت میں استعمال شدہ (کالی) سیاہی سے مختلف رنگ میں لگائے گئے۔ بالعموم یا کم از کم ابتداء میں ان علامتی نقطوں کے لئے سرخ رنگ ہی استعمال کیا گیا۔

۳۔ زبر (فتحہ) کے لئے متعلقہ حرف کے اوپر ایک نقطہ' زیر (کسرہ) کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ اور پیش (ضمہ) کے لئے حرف کے سامنے یعنی آگے بائیں طرف ایک نقطہ اور تنوین کے لئے دو دو نقطے مقرر کئے گئے۔

☆ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوالاسود کو حرکات بذریعہ نقاط متعین کرنے کا خیال سریانی یا عبرانی زبان میں مستعمل طریقہ (حرکات بذریعہ نقاط) سے پیدا ہوا[۲۱] جبکہ بعض اس نظریہ کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے بلکہ اس عمل کو ابولاسود کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔[۲۲] بہرحال ابوالاسود نے ابتداء صرف حرکاتِ ثلاثہ اور تنوین کو ہی نقطوں سے ظاہر کیا[۲۳] (باقی علامات بعد کی ایجاد ہیں)۔ کتابت مصاحف میں اصلاح یا تکمیل رسم عثمانی کے لئے علامات ضبط مقرر کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اور یہ علامات بھی تمام الفاظ کی بنائی حرکات کے لئے نہیں بلکہ زیادہ تر صرف اعرابی حرکات کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی گئی تھیں اور اس لئے ہی اسے نقط الاعراب کہتے تھے۔[۲۴]

۱۱۔ ابوالاسود کا یہ طریقہ بہت جلد کوفہ کے بعد بصرہ اور پھر مدینہ منورہ تک کے مصاحف میں استعمال ہونے لگا (خیال رہے کہ عموماً بڑے شہر ہی کتابت مصاحف کے مرکز رہے ہیں) اگرچہ نقطوں کے لئے مختلف شکل اور مختلف جگہ بھی استعمال ہونے لگی۔ مثلاً کوئی نقطے کو گول رکھتا اور اس لئے اسے "النقط المدور" بھی کہتے تھے' بعض نقطے کو مربع شکل میں لکھتے اور بعض اسے اندر سے خالی گول دائرہ (○) ہی بنا دیتے[۲۵] مکہ مکرمہ میں ضمہ (پیش) کا نقطہ حرف کے (بائیں طرف سامنے کی بجائے) اوپر اور فتحہ (زبر) کا نقطہ حرف کے اوپر کی

بجائے اس سے پہلے دائیں طرف لگانے کا رواج ہو گیا۔ (۲۶)

کتابت مصاحف میں علاماتِ ضبط کا یہ پہلا تنوع تھا جس کی بنا پر عموماً یہ پتہ چل جاتا تھا کہ کسی مصحف کی کتابت کس شہر یا کس علاقے میں ہوئی ہے۔

۱۲۔ ابوالاسود کی اس "اصلاح" کے باوجود ابھی تک یکساں صورت رکھنے والے حروف کی باہمی تمیز کے لئے کوئی تحریری علامت نہیں تھی اور ان کی درست قراءت کا انحصار تلقی و سماع پر ہی تھا(۲۷) عبدالملک اموی کے زمانے میں جب عربی کو دفتری زبان بنا دیا گیا تو نہ صرف قرآن کریم بلکہ عام عربی تحریر کو بھی اس التباس سے بچانا ضروری معلوم ہوا۔ خلیفہ کی اس خواہش کو عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے یوں پورا کیا کہ اس کے حکم پر بصرہ کے علماء میں سے ابوالاسود ہی کے دو شاگردوں نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نے عربی زبان کے اب تک رائج اٹھارہ حرفوں کو ان کی آوازوں کے مطابق اٹھائیس حرفوں میں بدلا اور چھوٹے چھوٹے نقطوں کے ذریعے متشابہ حروف کو باہم متمیز کر دیا۔ خیال رہے کہ ان اٹھائیس حروف کے (ان کی آوازوں کے لحاظ سے) نام پہلے سے الگ الگ موجود تھے، صرف ان کی کتابت کی شکلیں اٹھارہ تھیں (مثلاً "ح" کو ہی ج ح خ کہتے تھے) حرفوں پر اس قسم کے نقطے لگانے کے عمل کو اعجام کہتے ہیں۔ حرکات اور اصوات کے لئے، (دؤلی کے رائج کردہ) نقطوں کے برعکس، اعجام کے نقطے اسی سیاہی سے لگانے تجویز ہوئے جس سے اصل متن لکھا گیا ہو (۲۸) کتابتِ مصاحف میں حروف کی باہم پہچان اور تمیز کے لئے یہ دوسری اصلاحی کوشش تھی۔

۱۳۔ ان دونوں قسم کے نقطوں میں فرق کرنے کے لئے الگ الگ اصطلاحات تھیں۔ پہلے (ابوالاسود والے) طریقے کو نقط الحرکات، نقط الاعراب یا نقط الشکل کہتے تھے۔ جب کہ دوسری قسم (نصر اور یحییٰ کے طریقے پر حرفوں کے نقطے لگانے) کو نقط الاعجام کہتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ نصر اور یحییٰ سے بہت پہلے ـــــ بلکہ دورِ صحابہؓ یا شاید اس سے بھی پہلے ـــــ نقط الاعجام موجود تھا۔ اس نظریے کے موافق اور مخالف دلائل موجود ہیں (۲۹) تاہم یہ بات یقینی ہے کہ نقط الاعجام للتمییز بین الحروف المتشابهة کا استعمال اگر پہلے موجود بھی تھا تو بہت کم اور نادر ضرور تھا۔ مصحف (قرآن

مجید) کی کتابت میں اس نقط (الاعجام) کا استعمال یحییٰ اور نصر نے ہی بحکم حجاج شروع کیا۔ اور حجاج نے اس مفید "اصلاح" کے نفاذ کے لئے اپنی حکومت کی پوری مشینری اور اپنی ساری انتظامی صلاحیتوں کو صرف کیا[۳۰] اسی وجہ سے مؤرخین خط نقط اعجام کے اس طریقے کو "حجاج کا طریقہ" کہتے ہیں جب کہ رنگ دار نقاط برائے حرکات کے طریقے کو "ابو الاسود کا طریقہ" کہتے ہیں۔[۳۱]

۱۴۔ اس فن کی کتابوں میں مختلف حرفوں کے لئے مختلف تعداد کے نقطے (ایک، دو یا تین) اور ان کی جگہیں (اوپر یا نیچے) مقرر کرنے کی دلچسپ وجوہ اور اعجام کی مختلف صورتیں بھی بیان کی گئی ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔[۳۲] البتہ ایک اور بات جو خصوصاً قابل ذکر ہے، اگرچہ اس کا تعلق براہ راست علامات ضبط سے نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ نصر اور یحییٰ نے حروف تہجی کی روایتی ابجد ھوز حطی والی عبرانی ترتیب بدل کر ان کو تقریباً یہ ترتیب دی، جو اب تک ہمارے ہاں رائج ہے۔ ترتیب میں یہ تبدیلی دراصل اس مقصد کیلئے عمل میں لائی گئی تھی تاکہ یکساں صورت والے حروف کو یکجا یکجا کر دیا جائے۔[۳۳]

۱۵۔ ابو الاسود کے نقطوں کی طرح یحییٰ اور نصر یا حجاج کے نقاط حروف اور ترتیب تہجی بھی حجاز کے راستے مغرب میں بھی قدرے اختلاف یا تنوع کے ساتھ اختیار کر لئے گئے مثلاً مغرب میں "ف" کے سرے کے نیچے ایک نقطہ "ف" اور "ق" کے اوپر ایک نقطہ "ق" اختیار کیا گیا[۳۴] وہاں کسی لفظ کے آخر پر واقع ہونے کی صورت میں ف ق ن اور ی کو کسی قسم کے علامتی نقطوں کے بغیر لکھا جانے لگا۔ اسی طرح اہل مغرب (خیال رہے اسلامی تاریخ میں مغرب سے مراد مصر کے علاوہ تمام افریقی ممالک اور اندلس ہوتے ہیں۔ آج کل صرف مراکش کو بھی مغرب کہہ لیتے ہیں) کے ہاں عربی کے حروف تہجی کی ترتیب بھی مختلف رائج ہو گئی۔ اہل مشرق (مصر اور تمام ایشیائی ممالک) میں تو یہ ترتیب یوں ہے : ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ (بعض جگہ ہ و) اور ی۔ اس کے برعکس مغرب میں ر ز کے بعد سے یہ ترتیب اختیار کی گئی : ط ظ ک ل م ن ص ض ع غ ف ص ش ہ و ی۔[۳۵]

۱۶۔ عباسی دور کے ابتدائی کئی برسوں ـــــ بلکہ تقریباً ایک صدی تک ـــــ کتابتِ

مصاحف کا یہی طریقہ رائج رہا (یعنی حرکات بذریعہ رنگ دار نقاط اور حرفوں کے نقطے مقابلتاً ان سے ذرا چھوٹے مگر کتابت متن والی سیاہی سے لکھنا)۔ تاہم یہ دو دو قسم کے نقطے لکھنے اور پڑھنے والے، ہر دو کے لئے صعوبت اور التباس کا سبب بنتے تھے۔ اس لئے آہستہ آہستہ اعجام کے نقطے محض قلم کے قط کے برابر ہلکی ترچھی لکیروں کی صورت میں ظاہر کئے جانے لگے[۳۶] البتہ جب عربی خط میں تحسین و جمال کے پہلو ظاہر ہوئے اور مختلف حسین و جمیل اقلام (اقسامِ خط) ایجاد ہوئے تو نقطِ اعجام کے لئے بھی، تحریر کے حسن و جمال اور حروف کے ہندسی تناسب کو ملحوظ رکھتے ہوئے، مناسب قط اور نقاط کی وضع اور شکل کے لئے بھی خوشخطی کے قواعد مقرر کر لئے گئے۔

۱۷۔ دریں اثناء ابوالاسود اور یحییٰ و نصر کے تلامذہ اور متبعین نے اس طریقے (نقط الاعراب) کو وسعت دیتے ہوئے کچھ مزید علامات وضع کیں (اگرچہ ان واضعین کے نام تاریخ نے محفوظ نہیں رکھے) مثلاً "سکون" کے لئے چھوٹی سی افقی (سرخ) لکیر باریک قلم سے حرف کے اوپر یا نیچے مگر اس سے الگ لگانے لگے۔[۳۷] اسی طرح "تشدید" کے لئے حرف کے اوپر قوس کی افقی شکل (ں) کا نشان اختیار کیا گیا جس کے دونوں سرے اوپر اٹھے ہوتے تھے۔ حرف منوّن پر فتحہ (زبر) کی صورت میں سرخ نقطہ اس قوس کے اندر (ں)۔ کسرہ (زیر) کے لئے نیچے (ں) اور ضمہ (پیش) کے لئے یہ نقطہ قوس کے دائیں سرے کے اوپر لگاتے (ں)۔ پھر کچھ عرصہ بعد علامت تشدید والی قوس (ں) پر حرف منوّن کی حرکت کے لئے نقطہ لگانا ترک کر دیا گیا اور اس کی بجائے مشدد مفتوح حرف کی صورت میں "قوس تشدید" حرف کے اوپر (ں) اور مکسور مشدد کے لئے حرف کے نیچے الٹی قوس (ں) اور مشدد مضموم کے اوپر اوندھی شکل کی قوس (ں) بنانے لگے[۳۸] اس کے بعد علامت تشدید کے طور پر صرف دال مقلوبہ (ـد) بھی استعمال ہونے لگی۔[۳۹]

۱۸۔ ابوالاسود ہی کے طریق نقط کے تتبع میں "همزة الوصل" کے لئے زرد رنگ کا نقطہ اور "همزة القطع" کے لئے سرخ رنگ کا نقطہ اور بعض دفعہ همزة الوصل کے لئے سبز رنگ کا نقطہ اور همزة القطع کے لئے زرد رنگ استعمال ہوتا تھا[۴۰] ان علامات کے استعمال میں

بعض علاقائی ممیزات بھی ہوتے تھے' مثلاً عراق اور شام میں ہمزہ کے لئے سرخ نقطہ (حرکات کی طرح) رائج تھا جب کہ مدینہ منورہ' بصرہ اور بلاد مغرب میں ہمزہ کیلئے زرد رنگ کے نقطہ کارواج تھا۔ اس فرق کی وجہ سے آج بھی ہم کسی قدیم مصحف کے علاقہ کتابت یا زمانہ کتابت کے بارے میں فیصلہ کرسکتے ہیں۔[۴۱]

۱۹۔ اسی طرح تجویدی ضرورتوں کے مطابق اخفاء' اظہار' ادغام' اقلاب' کتابت ہمزہ کی مختلف صورتوں' ہمزہ اور الف یا دو "واؤ" یا دو "یا" کے اجتماع' زائد حرف کی شناخت اور "لا" میں لام اور الف کی تعیین وغیرہ جیسے امور کیلئے علامات اور انکے استعمال کے تفصیلی قواعد وجود میں آئے۔ حتیٰ کے یہ نظامِ نقط قرآن کریم کی تمام تجویدی اور صوتی ضروریات کیلئے خود مکتفی ہوگیا اور اس کو ایک مخصوص فن بنا دیا گیا' جس کی تفصیلات پر مستقل کتابیں لکھی گئیں' جن کا ذکر ہم ابھی آگے چل کر کریں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ ابوالاسود یا ان کے متبعین کی وضع کردہ علاماتِ ضبط ہمیشہ متن کی سیاہی سے مختلف رنگ (عموماً سرخ) میں لکھی جاتی تھیں۔ نیز یہ نظامِ نقط زیادہ تر صرف کتابت مصاحف میں استعمال ہوتا تھا[۴۲] اور الدانی کی بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بالعموم کاتب متن ایک شخص ہوتا تھا اور ناقط دوسرا شخص ہوتا تھا۔ اگرچہ بعض دفعہ کاتب اور ناقط ایک ہی شخص بھی ہوتا تھا۔[۴۳] اب بھی دنیا میں اس طریق نقط و شکل کے مطابق لکھے ہوئے مصاحف کی خاصی تعداد مختلف جگہوں پر محفوظ ہے اور اگرچہ اصل تک تو بہت کم آدمیوں کی رسائی ہو سکتی ہے تاہم عصر حاضر کی طباعتی سہولتوں کی بنا پر اس قسم کے مصاحف سے رنگ دار نمونے مطبوعہ شکل میں مختلف کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں اور ان کے ذریعے نقط حرکات اور نقط اعجام کے قواعد کی عملی تطبیقات کو سمجھا جاسکتا ہے۔[۴۴]

۲۰۔ نقاط کی مشابہت سے پیدا ہونے والے التباس کے امکان کو کم کرنے کے لئے اور کتابت میں بیک وقت متعدد سیاہیوں کے استعمال کی صعوبت سے بچنے کے لئے ایک اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگی[۴۵] مشہور نحوی اور واضع علم العروض الخلیل بن احمد الفراہیدی (م ۱۷۰ھ) نے وقت کی اس ضرورت کو نئی علامات ضبط ایجاد کرکے پورا کیا[۴۶] اور یہی وہ علامات ضبط ہیں جو کم و بیش آج بھی ہر جگہ نہ صرف کتابت مصاحف میں

بلکہ کسی بھی مشکول عربی عبارت کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

۲۱۔ الخلیل نے نقط اعجام کو متن کی سیاہی سے لکھنا اسی طرح برقرار رکھا بلکہ اس نے حرفوں کے نقطوں کی تعداد اور ان کی جگہ کے تعین کے اسباب و علل بھی بیان کئے[۴۷] البتہ اس نے الشکل بالنقاط کی بجائے الشکل بالحرکات کا طریقہ ایجاد کیا۔ یعنی فتحہ (زبر) کیلئے حرف کے اوپر ایک ترچھی لکیر (ـَـ) کسرہ (زیر) کیلئے حرف کے نیچے ایک ترچھی لکیر (ـِـ) اور ضمہ (پیش) کے لئے حرف کے اوپر ایک مخفف سی واؤ کی شکل (ـُـ) لگانا تجویز کیا اور تنوین کیلئے ایک کی بجائے دو دو حرکات (ـً ـٍ ـٌ) مقرر کیں۔

☆ ان حرکاتِ ثلاثہ کے علاوہ الخلیل نے پانچ نئی علاماتِ ضبط ایجاد کیں یا ان کے لئے (حرکاتِ ثلاثہ کی طرح) ایک نئی صورت وضع کی۔ الخلیل کی علامات دراصل حرکت کی صوتی مناسبت سے کسی باریک سے حرف یا علامت کے نام یا اس کے کسی حصے کی مخفف شکل تھیں۔ گویا ہر علامت ضبط اپنے مدلول پر دلالت کرتی تھی (ابوالاسود والے طریقے میں دال اور مدلول میں ایسی کوئی مناسبت نہیں تھی) مثلاً الخلیل نے فتحہ کے لئے "الف صغیرہ مبطوحہ" (چھوٹا سا ترچھا الف)، کسرہ کے لئے "یاء کا مخفف سرا" (ـِـ) اور ضمہ کے لئے "واؤ کی مخفف صورت" اختیار کی[۴۸] اسی طرح اس نے سکون کے لئے حرف ساکن کے اوپر "ہ" یا "د" کی علامت وضع کی جو لفظ "جزم" کے ج یا م کے سرے کا مخفف نشان ہے۔ شدہ یا تشدید کیلئے اس نے حرفِ مشدد کے اوپر "س" لگانا تجویز کیا جو "ش" کے سرے سے ماخوذ ہے۔ مدہ یا تمدید کے لئے حرف ممدود کے اوپر "سہ" کی علامت اختیار کی جو دراصل خود لفظ "مد" ہی کی دوسری یا مخفف شکل ہے۔ اسی طرح "ہمزۃ الوصل" کے لئے الف کے اوپر "صہ" یعنی "صلہ" کے "ص" کی ایک صورت اور ہمزۃ القطع کیلئے "ء" کی علامت وضع کی جو حرف عین (ع) کے سرے سے ماخوذ ہے[۴۹]۔ کہتے ہیں کہ الخلیل نے "رَوم" اور "اشمام" کے لئے بھی علامات وضع کی تھیں[۵۰]۔

۲۲۔ الخلیل کی ایجاد کردہ علامات کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں کتابت کے لئے دو سیاہیاں استعمال کرنا لازمی نہ تھا بلکہ متن (قرآن) اور علاماتِ ضبط سب ایک ہی

سیاہی سے لکھے جانے لگے۔ اس سے کتابت میں صعوبت اور قراءت میں التباس کے امکانات کم تر ہو گئے' اس لئے یہ طریقہ بہت جلد مقبول ہو گیا۔ آج کل دنیا بھر میں کتابت مصاحف کے لئے علاماتِ ضبط کا یہی طریقہ رائج ہے۔ البتہ ضرورتاً ـــــ اور بعض جگہ رواجاً ـــــ اس میں مزید اصلاحات اور ترمیمات کا عمل جاری رہا۔ مثلاً افریقی ممالک کے مصاحف میں اور برصغیر یا وسط ایشیا کے خط بہار میں لکھے ہوئے مصاحف میں یہ حرکات ترچھی ڈالنے کی بجائے بالکل افقی ڈالی جاتی ہیں۔ چین میں تشدید "ـّ" کی بجائے "س" کے سرے کے دو دندانے لکھ کر آخر میں ذرا کھینچ دیتے ہیں "سہ" اسی طرح ضمہ کی شکلیں بھی بعض ممالک میں مختلف ہوتی ہیں [مثلاً ء و ۂ ہ ھ وغیرہ]۔ مگر یہ سب الخلیل ہی کے طریقے کا تتبع یا تنوع ہے۔ الخلیل کی وضع کردہ علاماتِ ضبط' کتابت مصاحف میں علاماتِ ضبط کی اصلاح یا تکمیل کی تیسری کوشش تھی جو ایک بڑے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔[(۵۱)]

(جاری ہے)

حواشی

۱۷۔ مختلف روایات کے حوالوں کے لئے دیکھئے غانم ص ۴۹۱ اور ابو الاسود کی شخصیت کے تعارف کے مصادر کے لئے اسی (غانم) کا ص ۹۸۔۴۹۷ (حواشی نمبر ۳۳ تا ۴۱) نیز الاعلام جلد سوم ص ۳۴۰۔

۲۰۔ حوالہ مذکورہ بالا نیز قصہ ص ۵۲' غانم ص ۵۰۱ ببعد اور المحکم ص ۴ ببعد۔

۲۱۔ الکردی ص ۸۵' المحکم (مقدمۂ محقق) ص ۲۹۔۲۸

۲۲۔ اس موضوع پر مفصل اور دلچسپ بحث کے لئے دیکھئے غانم ص ۱۶۔۵۰۹

۲۳۔ المقنع ص ۱۲۵

۲۴۔ ایک مدت تک بعض اہل علم قرآن کے ہر ایک حرف پر علامت ضبط لگانے کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علامت ضبط صرف التباس سے بچنے کے لئے لگانی چاہئے۔ دیکھئے المصاحف ص ۱۴۴ نیز اس موضوع پر ذرا تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے غانم ص ۵۲۴ ببعد۔

۲۵۔ الکردی ص ۸۷' الجبوری ص ۱۵۳ ۲۶۔ المنجد ص ۱۲۷

۲۷۔ صفدی ص ۱۳ ۲۸۔ قصہ ص ۵۲' الزنجانی ص ۹۰

۲۹۔ صفدی ص ۱۳' غانم ص ۵۳۸ ببعد اور المنجد ص ۱۲۵ ببعد۔ المورد ص ۱۲

۳۰۔ فضائلی ص ۱۳۷، الکردی ص ۹۵ نیز صفدی ص ۱۳

۳۱۔ لنگر (I) ص ۲۰ بعد جہاں 1b اور اس کے بعد متعدد اندراجات میں یہ اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ نیز صفدی ص ۱۴

۳۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ابن درستویہ ص ۵۴ بعد، المحکم ص ۳۵ بعد، الکردی ص ۹۵۔۹۴، غانم ص ۵۵۶ بعد اور فضائلی ص ۱۳۷

۳۳۔ الخط العربی ص ۱۲، الکلاک ص ۵۲، بحوالہ الرافعی، فضائلی ص ۱۳۸، غانم ص ۵۷۱ بحوالہ البلوی۔ مؤخر الذکر مرجع میں اس ترتیب جدید کی نصر اور یحیی کی طرف نسبت کو محل نظر اور اسے حفنی ناصف کے ایک غیر مستند قول پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس ترتیب کے بعد از اسلام ظہور اور کم از کم الخلیل بن احمد کے زمانہ (اواخر قرن دوم) تک "معروف" ہونے کا اقرار بھی کیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے نفس المرجع (یعنی غانم) ص ۵۷۲۔۵۷۱

۳۴۔ اور اس تنوع پر ایک دلچسپ تبصرہ کے لئے دیکھئے الکردی ص ۹۵۔۹۴

۳۵۔ المحکم ص ۳۶، المصور ص ۳۳۵ و ۳۳۸

۳۶۔ غانم ص ۶۲۔۵۶۱۔ اور اس طرز تحریر کا نمونہ دیکھنے کے لئے دیکھئے لنگر (I) پلیٹ نمبر II و III اور لنگر (II) کی پلیٹ نمبر ۸۔ نیز آربری کی پلیٹ نمبر ۱۵ (مؤخر الذکر رنگ دار نہیں۔ تاہم دونوں قسم کے نقاط کا صاف پتہ چل جاتا ہے)

۳۷۔ المحکم (مقدمۂ محقق) ص ۳۹ جہاں رنگ دار نمونہ بھی دیا گیا ہے۔

۳۸۔ الجبوری ص ۱۵۳، الکردی ص ۸۷۔۸۶، الزنجانی ص ۸۸ اور عبود ص ۴۰، المقنع ص ۱۳۰ اس کا نمونہ دیکھئے آربری پلیٹ نمبر ۱ (اول)

۳۹۔ دیکھئے حوالہ نمبر ۳۷ مذکورہ بالا۔ نیز دیکھئے یہی کتاب (المحکم) ص ۵۰ بعد اور الطراز ورق ۲۸ الف و ب، جہاں اس کو تشدید اہل مدینہ کہا گیا ہے۔

۴۰۔ الزنجانی ص ۹۰، المحکم ص ۸۴ بعد۔

۴۱۔ المنجد ص ۱۲۷۔ ۴۲۔ الزنجانی ص ۹۰

۴۳۔ مثلاً المحکم ص ۹ پر بعض مشاہیر نقّاط کا ذکر ہے اور اسی کتاب میں متعدد جگہ پر "نقاط اندلس" "نقاط مدینہ" وغیرہ کا حوالہ موجود ہے۔

۴۴۔ مثلاً دیکھئے آربری پلیٹ نمبر ۱، لنگر (I) پلیٹ نمبر ۲، ۳ اور لنگر (II) پلیٹ نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ اور ۸

۴۵۔ قصہ ص ۵۲، صفدی ص ۱۳، فضائلی ص ۱۳۸، الکردی ص ۹۱، غانم ص ۵۰۵ بعد۔

۴۶۔ الطراز ورق ۳/ب، ۴/الف۔ نیز اس "نابغۂ عصور" ہستی کے تعارف اور اس کے اصل

مراجع کے لئے دیکھئے الاعلام ج ۲ص ۳۶۳ اور جرجی ج ۲ص ۴۴۱ احاشیہ شوقی ضیف ۷۴۔

۴۷۔ تفصیل کے لئے دیکھئے المحکم ۳۶-۳۵ اور غانم ص ۵۵۵ بعد۔

۴۸۔ الطراز ورق ۵/ب' الکردی ص ۹۱

۴۹۔ قصہ ص ۵۳' عبود ص ۳۹ بعد۔ مجلہ الکلیہ ص ۳۴۰' فضائلی ص ۳۹-۳۸ او غانم ص ۵۸۹ بعد۔

۵۰۔ المحکم ص ۶' عبود ص ۳۹ جہاں مصنف نے علامت روم واشمام سے عدم واقفیت کا ذکر کیا ہے مگر غانم نے (ص ۵۰۸) سیبویہ تلمیذ الخلیل کے حوالے سے ان علامات کی صورت کا ذکر کیا ہے۔

۵۱۔ دیکھئے حوالہ نمبر ۴۹ مذکورہ بالا۔

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہدِ صدیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنادیا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوتے
- سیّد الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون ہے تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو ۲ جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجئے

تعمیرِ شخصیت اور فلاحِ انسانیت (۲)

سید توقیر حسین شاہ

فلاح انسانیت

اسلام فرد کی انفرادیت کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اجتماعیت کو فرد ہی کی اصلاح و فلاح کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ سیرتِ طیبہ کے نقطۂ نظر سے فرد کی تربیت کا مقصد اس کی شخصیت کی ایسی متوازن تعمیر ہے جس سے نہ صرف یہ کہ وہ خود صالح بن سکے بلکہ انسانیت کی فلاح اور نشوونما کا باعث بھی ہو۔ نبی اکرم ﷺ چونکہ پوری انسانیت کے لئے مبعوث ہوئے' جیساکہ ارشاد ربانی ہے :

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ (سبا : ۲۸)

"اور ہم نے آپ کو ساری انسانیت کے لئے بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا"۔

لہٰذا نبی اکرم ﷺ کی سیرت ایسی بے مثال ہے جس میں نہ صرف ایک شخص کی متوازن تعمیر کے لئے بلکہ ساری انسانیت کی فلاح اور نشوونما کے لئے تعلیمات موجود ہیں۔ آپ نے انفرادی طور پر شخصیت کی تعمیر و تربیت کرکے اسے معاشرے کا فعال فرد بنادیا جو کہ پوری کی پوری انسانیت کی فلاح کا باعث بنا۔ انبیاء کے ماسوا کوئی عنصر تاریخ میں ایسا دکھائی نہیں دیتا جو انسان کو ـــــ پورے کے پورے انسان کو' اجتماعی انسان کو ـــــ اندر سے بدل سکا ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ کی دعوت نے پورے کے پورے انسان کو' اجتماعی انسان کو' اندر سے بدل دیا اور صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے بازار تک' مدرسہ سے عدالت تک اور گھروں سے میدان جنگ تک چھا گیا۔ ذہن بدل گئے' خیالات کی رو بدل گئی' نگاہوں کا زاویہ بدل گیا' عادات و اطوار بدل گئے' رسوم و رواج بدل گئے (۳۲) اور انسانیت فلاح کے راستے پر گامزن ہوگئی۔ انسانیت کی شاید سب سے بڑی بدنصیبی

یہ رہی ہے کہ جس کسی کو بھی برسراقتدار آنے کا موقع ملا' تلوار کے زور سے یا سازش کے بل بوتے پر (۳۳)، لیکن محسن انسانیت ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا' اس کی روح تشدد کی روح نہ تھی' محبت و خیر خواہی کی روح تھی (۳۴)۔

اب ہم سیرت طیبہ اور اتباع رسول ﷺ کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ وہ کون سے پودے ہیں جو کہ انسانیت کی بستی میں لگا کر اس کی فضا کو پاکیزہ و معطر بنا کر فلاح انسانیت کا باعث بنایا جاتا ہے اور وہ کون سے جو ہر پارے ہیں جو انسانیت کی فلاح کے ضامن ہیں۔

مساوات : انسانیت کی فلاح کے لئے سب سے پہلا ضروری عنصر مساوات ہے۔ فلاح انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے میں بسنے والے ہر فرد کو' چاہے وہ کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو' بحیثیت انسان یکساں عزت و اہمیت حاصل ہو۔

مساوات کی تعلیم دیتے ہوئے حضور اکرم ﷺ نے خطبہ **حجۃ الوداع** کے بین الاقوامی اعلامیہ میں جو منشورِ اعظم پائیدار طریقے سے پیش فرمایا وہ ایسے آفاقی اقدارِ اعلیٰ کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت تمام تفریقات کو ختم کر کے پورے عالم میں اعلیٰ اقدارِ انسانی کا تسلط ہو گا اور دنیا بھر کی انسانی برادری ایک ہی آفاقی ہیئت اجتماعی کی تشکیل کر کے انسانیت کو ہر طرح کے غم و الم سے نجات دلا سکے گی۔ (۳۵) آپؐ کا فرمان ہے :

> "اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ ایک ہے۔ سنو! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر' کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں' سوائے تقویٰ کے"۔ (۳۶)

عملی طور پر مساوات کا مظاہرہ ہمیں غزوۂ احزاب کے موقع پر نظر آتا ہے کہ جب تمام صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس مٹی ڈھو رہے تھے' یہاں تک کہ آپؐ کے جسم اطہر پر مٹی ہی مٹی نظر آ رہی تھی۔ (۳۷)

محبت و اخوت : اخوت کے معنی بھائی چارے اور برادری کے ہیں۔ سیرت نبویؐ سے حاصل ہونے والا دوسرا جو ہر پارہ جو باعث فلاح انسانیت ہے وہ جذبۂ محبت و اخوت ہے۔ اسی جذبہ کی بدولت انسانوں کا آپس میں پیار و محبت کا رشتہ قائم ہوتا ہے اور ایک انسان

دوسرے انسان کے دکھ سکھ میں شریک رہتا ہے اور لوگوں کے درمیان ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ بعثت سے قبل عرب ایک دوسرے سے جنگ و جدل میں مصروف رہتے اور معاشرہ بدامنی کا شکار تھا لیکن نبی اکرم ﷺ نے بعثت کے بعد اسی معاشرہ کو مثالی بنادیا اور انسانیت کو اس کی معراج پر پہنچادیا اور فلاح انسانیت کے حصول کے لئے لوگوں کی آپس کی دشمنی و عداوت کو محبت و اخوت میں بدل دیا اور انسانیت کو ترقی و فلاح کے راستے پر گامزن کردیا۔ اخوت کا درس دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا :

"بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ نہ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنو نہ جاسوسی کرو۔ نہ دوسرے کے سودے پر دھوکہ دینے کے لئے قیمت بڑھا کر لگاؤ۔ نہ آپس میں حسد کرو۔ نہ باہم بغض رکھو۔ نہ آپس میں بول چال بند کرو اور سب اللہ کے بندے آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ"۔ (۳۸)

چنانچہ اس حدیث مبارکہ میں محبت و اخوت کی تلقین کے ساتھ ساتھ اخوت اور فلاح انسانیت کے لئے باعث نقصان رذائل اخلاق 'بدگمانی' تجسس' جاسوسی' تناحش' حسد اور قطع کلامی و بغض کی بھی سختی کے ساتھ ممانعت کردی۔

جذبۂ رحم دلی : جذبۂ رحم دلی فلاح انسانیت کے حصول کے لئے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس جذبہ کی کارفرمائی سے انسانیت کا آپس میں پیار اور محبت کا رشتہ قائم ہوتا ہے جو فلاح انسانیت کا باعث بنتا ہے۔ قوم کی ہمدردی' محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے کہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ "وہ لوگ آپس میں رحمدل ہیں"۔ (الفتح : ۲۹) اس کی اہمیت اور تعلیم کے پیش نظر خدا کی رحمت کو بندے کی رحمدلی سے مشروط کرتے ہوئے فرمایا :

"جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔ (۳۹)

خود نبی کریم ﷺ جذبۂ رحم دلی کا مجسمہ تھے۔ انسان ہو یا غیر انسان' چھوٹا ہو یا بڑا' آقا ہو یا غلام' مسلم ہو یا غیر مسلم' سب کے لئے آپؐ کی رحمت کے دروازے کھلے تھے کیونکہ آپؐ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا اور کسی خاص وقت' علاقے یا قوم کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے۔ ارشادِ ربانی ہے :

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (الانبیاء : ۱۰۷)

"اور ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا"۔

نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی اظہارِ رحمت سے بھری پڑی ہے جس کا احاطہ ان چند اوراق میں ناممکن ہے۔

ایثار : ایثار کا مطلب ہے دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر مقدم رکھا جائے۔ یہ ایک ایسا اخلاقی وصف ہے جو ایک شخص کے دل میں دوسرے شخص کی محبت اور مقام و مرتبہ پیدا کرتا ہے اور کوئی شخص اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ جب کسی معاشرہ میں بسنے والے افراد کے دلوں میں ایثار کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ معاشرہ فلاح انسانیت کا ضامن بن جاتا ہے۔ آپؐ کی تعلیمات کا اثر تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر وقت ایثار کے لئے تیار رہتے۔ ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ کاشانۂ نبوی میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا اس لئے آپؐ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا خدا تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں : صرف بچوں کا کھانا۔ بولے : بچوں کو سلا دو اور چراغ بجھا دو' ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے' البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا : خدا تعالیٰ تمہارے حسن سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ (۴۰)

عفو و درگزر : فلاح انسانیت کے لئے سیرت طیبہ سے حاصل ہونے والا ایک اور سنہری اصول عفو و درگزر ہے۔ اخلاق کی سب سے بھاری تعلیم جو نفوس پر شاق گزرتی ہے وہ عفو و درگزر ہی ہے۔ لہٰذا اپنے نفس کی منفی قوت کو دبا کر دوسرے انسان کو' چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب' قبیلے' ذات یا خاندان سے ہو' معاف کر دینا ہی معراج انسانیت اور باعث فلاح انسانیت ہے۔ جب کسی معاشرہ میں بسنے والے افراد کے دلوں میں عفو و درگزر کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ معاشرہ فلاح انسانیت کا ضامن بن جاتا ہے۔ ایک حدیث

میں ہے :

"ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا : میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں؟ آپؐ چپ رہے۔ اس نے پھر پوچھا تو فرمایا : ہر روز ستر دفعہ"۔ (۴۱)

فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے اپنے تمام دشمنوں کو یہ کہہ کر معاف کر دیا :

"آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ (۴۲)

چنانچہ آپؐ کے حسن سلوک اور عفو و درگزر کی شان دیکھ کر وہ سب مسلمان ہو گئے اور معاشرے کے بامقصد شہری بن گئے۔

عدل و انصاف : کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی ایک میں ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں عدل کہتے ہیں۔ (۴۳) سیرت طیبہ سے حاصل ہونے والا یہ سنہری اصول اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کی دشمنی کے باوجود بھی عدل کو قائم کرنے کا حکم دیا۔ ارشادِ ربانی ہے :

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (المائدۃ : ۸)

"اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل ہی نہ کرو۔ عدل کرتے رہو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرتی انصاف اور عدل اجتماعی کا جو عملی نمونہ دنیا والوں کے سامنے پیش فرمایا، رنگ و نسل، فرقے، برادری اور گروہوں کی تفریقات کا شکار آج کا انسان اس سے رہنمائی حاصل کر کے نفرتوں اور راذیتوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ (۴۴)

حدیث شریف میں ہے :

"ایک دفعہ ایک عورت نے، جو خاندان مخزوم سے تھی، چوری کی۔ قریش کی عزت کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب خاص تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے معافی کی درخواست

کی۔ آپؐ نے غصہ ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے اور امراء سے درگزر کرتے"۔ (۴۵)

اس کے علاوہ خشیت الٰہی، حسن خلق، جود و سخا، تواضع، مہمان نوازی، شرم و حیا، عزم و استقلال، ایفائے عہد اور زہد و قناعت ایسے اخلاقی پہلو ہیں جو کسی شخص کی متوازن تعمیر کر کے اسے فلاح انسانیت کا باعث بننے میں مدد دیتے ہیں۔

مصادر و مراجع

۱) الجامع الصحیح (مترجم)، محمد بن اسماعیل بخاری، ترجمہ : ظہور الباری الاعظمی، دار الاشاعت کراچی، ۱۹۸۵ء

۲) الجامع الصحیح (مترجم)، مسلم بن الحجاج، ترجمہ : مولانا وحید الزمان، نعمانی کتب خانہ لاہور، ۱۹۸۱ء

۳) الجامع الصحیح (مترجم) ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، ترجمہ : حافظ حامد الرحمٰن، محمد سعید اینڈ سنز کراچی، ۱۹۶۸ء

۴) سنن ابی داؤد (مترجم) ابو داؤد سلیمان بن الاشعث، ترجمہ : مولانا وحید الزمان، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۸۳ء

۵) سنن ابن ماجہ (مترجم) ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، ترجمہ : مولانا وحید الزمان، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۸۵ء

۶) سنن النسائی (مترجم) ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی، ترجمہ : مولانا وحید الزمان، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۵۸ء

۷) کنز العمال علامہ علاء الدین علی المتقی، موسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۹۷۹ء

۸) اسلام اور تعمیر شخصیت، میاں عبدالرشید، ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان

۹) اسلام کا نظام تربیت، محمد قطب، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۰) سیرت مجمع کمالات، پروفیسر محمد عبدالجبار، ادارہ تعلیمات سیرت، علامہ اقبال کالونی سیالکوٹ

۱۱) سیرت النبی، مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، دینی کتب خانہ لاہور، ۱۹۷۵ء

۱۲) محسن انسانیت، نعیم صدیقی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۳) سیرت النبی (ترجمہ) ابن ہشام، شیخ غلام اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۸ء

حواشی

۱) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۱۳ ۲) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۱۷
۳) سنن ابو داؤد، باب صلوٰۃ اللیل ۴) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۵
۵) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۱۳ ۶) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۱۴
۷) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۱۴ ۸) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۱۵
۹) اسلام اور تعمیر شخصیت، ص ۱۰ ۱۰) صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب ۵۵۴
۱۱) صحیح بخاری، کتاب الاضاحی، باب من قال الاضحیٰ یوم النحر
۱۲) اسلام کا نظام تربیت، ص ۱۷۹ ۱۳) اسلام کا نظام تربیت، ص ۱۷۹
۱۴) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم
۱۵) صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب البیعہ علی ایتاء الزکوٰۃ
۱۶) کنز العمال، باب ۱۰۸۴
۱۷) صحیح بخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی
۱۸) سیرت النبی، ج ۲، مطبوعہ ۱۹۲۰ء ۱۹) سیرت النبی ج ۲، مطبوعہ ۱۹۲۰ء
۲۰) سیرت النبی، جلد ششم، ص ۴۹۸
۲۱) صحیح بخاری، کتاب الفضائل، باب مالقی النبی واصحابہ من المشرکین بمکۃ
۲۲) سیرت النبی، ج ۱، ص ۲۱۹، الرحیق المختوم ص ۱۶۹، تفصیل سیرت ابن ہشام ص ۸۹
۲۳) ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب تلقین السارق۔ سنن نسائی، کتاب قطع الید باب تلقین السارق
۲۴) ترمذی شریف، جلد دوم، ابواب صفۃ القیامۃ، معارف الحدیث، جلد دوم، کتاب الزہد
۲۵) کنز العمال ۲۶) سیرت النبی، جلد ششم، ص ۴۴۱
۲۷) ترمذی شریف، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی کثرۃ الغضب
۲۸) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل حمزہ رضی اللہ عنہ
۲۹) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب الجنۃ تحت بارقۃ السیوف۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب کراھۃ تمنی لقاء العدو
۳۰) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب یوم حنین
۳۱) صحیح بخاری، کتاب الادب ۳۲) محسن انسانیت، ص ۲۲

۳۳) محسن انسانیت، ص ۴۴ ۳۴) محسن انسانیت، ص ۴۵
۳۵) سیرت مجمع کمالات، ص ۳۱۱
۳۶) مسند احمد بحوالہ سیرۃ النبی جلد دوم، ص ۱۵۵، مطبوعہ ۱۹۳۰ء
۳۷) صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۂ احزاب
۳۸) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن
۳۹) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد و تقبیلہ و معانقتہ
۴۰) صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، باب اکرام الضیف
۴۱) ترمذی شریف، ابواب البر و الصلۃ باب ماجاء فی العفو عن الخادم
۴۲) کنز العمال، جلد اول، سیرت ابن ہشام، جلد دوم، ص ۴۸۹
۴۳) المفردات، بحوالہ سیرت النبی جلد ششم ص ۳۹۷
۴۴) سیرت مجمع کمالات، ص ۳۱۰ ۴۵) صحیح بخاری، کتاب الحدود

ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے

امام عبدالعظیم منذری رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرشید عراقی

ائمۂ حدیث میں امام زکی الدین عبدالعظیم منذری صاحب کمال محدث تھے۔ حدیث کے علاوہ دوسرے علومِ اسلامیہ یعنی تفسیر، قراءت، فقہ، اصول فقہ، لغت وادب اور تاریخ وغیرہ میں بھی یکتا تھے ـــــ ان کے علمی تبحر کا علمائے فن اور ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے۔

حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الکبیر الامام الثبت اور شیخ الاسلام کے الفاظ سے یاد کیا ہے[1]۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی ان کو شیخ الاسلام اور سلطان العلماء لکھا ہے اور اس کے ساتھ اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ فن قراءت میں ان کو کمال حاصل تھا[2]۔

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام، جو حافظ منذری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، کا بیان علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب حسن المحاضرہ اور حافظ ابن سبکی نے اپنی کتاب طبقات الشافعیہ میں درج کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

> "ہمارے شیخ زکی الدین عبدالعظیم منذری فن حدیث میں عدیم المثال تھے۔ حدیث کے صحیح وسقیم معلول کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے احکام ومعانی اور مشکلات کو حل کرنے میں پوری مہارت رکھتے تھے اور اس کے لغات اور ضبط الفاظ میں کامل تھے۔ احادیث کے لفظی فروق پر گہری نظر تھی"۔[3]

علامہ ابن دقیق العید جن کے بارے میں ابن سبکی نے لکھا ہے کہ وہ باتفاق ساتویں صدی ہجری کے مجدد تھے، فرماتے ہیں کہ امام عبدالعظیم منذری کو میں اپنے سے زیادہ متدین سمجھتا ہوں۔[4] حافظ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں شیخ عزالدین عبدالسلام کے حالات بیان کرتے ہوئے شیخ ابوالحسن شاذلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

> "مجھ سے کہا گیا ہے کہ روئے زمین پر علم فقہ کی کوئی مجلس شیخ عزالدین عبدالسلام

کی مجلس سے بہتر نہیں ہے اور روئے زمین پر علم حدیث میں کوئی مجلس شیخ زکی الدین عبدالعظیم المنذری کی مجلس سے زیادہ بارونق و عمدہ نہیں۔ اور تختہ زمین پر علم اور حقائق و معارف کے لحاظ سے تمہاری مجلس سے عمدہ و بہتر کوئی مجلس نہیں ہے"۔ (۵)

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اپنے استاد عبدالمؤمن کے یہ الفاظ درج کئے ہیں :

"میں ان کے پاس مبتدی کی حیثیت میں آیا تھا اور فاضل بن کر ان کے پاس سے گیا"۔ (۶)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

عنی بهذا الشان حتی فاق اهل زمانه فیه

"فن حدیث میں دائم الاشتغال اور منہمک رہے' یہاں کہ اپنے اہل زمانہ سے سبقت لے گئے"۔ (۷)

حدیث کے علاوہ فقہ اور عربیت اور قراءت میں بھی صاحب کمال تھے۔ اور شعرو سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :

کان اماماً حجةً بارعاً فی الفقه و العربیة و القراءات

"آپ فقہ اور عربیت اور قراءت کے فنون میں بھی امام کامل اور سند تھے"۔ (۸)

علامہ ابن عماد حنبلی نے شذرات الذہب میں علامہ ابن شیبہ کا یہ قول نقل کیا ہے :

یبرح فی العربیة و الفقه

"عبدالعظیم منذری کو فقہ اور عربیت میں کمال حاصل تھا"۔ (۹)

حافظ منذری کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطن کی روشنی سے بھی بھرپور حصہ عطا فرمایا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں "کان ذا نسک و تزهد" یعنی عبادت گزار اور زاہد آدمی تھے۔ (۱۰) علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں : کان الحافظ الکبیر الورع الزاهد "بڑے حافظ بہت پرہیز گار اور زاہد تھے" اور حافظ ابن سبکی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ان کی پرہیز گاری کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ فقہی اعتبار سے امام شافعی کے مذہب سے وابستہ تھے۔ (۱۱)

نام و نسب : حافظ الامام شیخ زکی الدین عبدالعظیم منذری یکم شعبان ۵۸۱ھ کو مصر میں پیدا ہوئے۔ (۱۲)

تحصیل علم : آپ نے تحصیل علم کیلئے مکہ، مدینہ، بیت المقدس، دمشق، حران، رے اور اسکندریہ کے سفر کئے اور ہر جگہ کے اساطینِ علم و فن سے اکتسابِ فیض کیا۔ (۱۳)

اساتذہ کرام : حافظ عبدالعظیم منذری کے اساتذۂ کرام کی فہرست طویل ہے۔ حافظ ابن سبکی نے طبقات الشافعیہ میں انکے اساتذہ کے نام درج کئے ہیں اور ابن عماد حنبلی نے بھی شذرات الذہب میں انکے اساتذہ کی فہرست درج کی ہے۔ حافظ منذری کے اساتذہ میں امام موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ حنبلی بھی شامل ہیں۔ (۱۴)

تلامذہ : امام منذری کے تلامذہ کا حلقہ بھی وسیع ہے۔ ان کے مشہور تلامذہ میں شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلام اور قاضی القضاۃ علامہ تقی الدین ابن دقیق العید شامل ہیں۔ (۱۵)

درس و تدریس : حافظ منذری کی ساری زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ پہلے جامعہ ظافری قاہرہ میں درس دیتے رہے اور اس کے بعد مدرسہ کاملیہ میں ۲۰ سال تک تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ درس و تدریس اور علمی انہماک و اشتغال کا یہ عالم تھا کہ سوائے نماز جمعہ کے مدرسہ کاملیہ سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ان کے ایک صاحبزادے، جو بڑے محدث اور فاضل تھے، کا انتقال ہوا تو مدرسہ کاملیہ میں ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور صرف دروازے تک جنازے کے ساتھ آئے اور وہیں سے رخصت کرکے واپس ہو گئے کہ جاؤ بیٹا میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔ (۱۶)

وفات : حافظ منذری نے ۶۵۶ء میں مصر میں وفات پائی۔ (۱۷)

تصانیف

حافظ منذری ایک کامیاب مصنف تھے۔ آپ نے حدیث، فقہ، تاریخ اور رجال وغیرہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔ اہل علم نے ان کی تصانیف کی تعریف کی ہے۔ آپ کی چند کتابوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

مختصر صحیح مسلم : حافظ منذری نے الجامع الصحیح المسلم کا مختصر لکھا۔ محی السنہ مولانا سید نواب صدیق حسن خان نے اس کی شرح "السراج الوھاج" کے نام سے لکھی، جو مطبوع ہے۔ (۱۸)

مختصر سنن ابی داؤد : حافظ ابن قیم اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

ان الحافظ زکی الدین المنذری قد احسن فی اختصارہ فھذبتہ نحو ما ھذب ھو وزدتُ علیہ من الکلام علی علل سکت عنھا اذ لم یکملھا

"حافظ زکی الدین منذری نے اس (سنن) کا بڑا اچھا اختصار کیا ہے۔ میں نے بھی اسی نہج پر اسکو مرتب و مہذب کیا ہے اور جن علل وغیرہ پر انہوں نے سکوت کیا تھا ان پر بھی کلام کیا ہے۔ اسلیئے کہ منذری اس کو مکمل نہیں کر سکے تھے"۔ (۱۸)

حافظ ابن کثیر اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

"وھو احسن اختصارًا من الاول"

"مختصر صحیح مسلم سے سنن ابی داؤد کا اختصار زیادہ عمدہ ہے"۔ (۱۹)

عمل الیوم واللّیلۃ : اس کتاب میں رات دن کے معمولات، عبادات اور افکار و اوراد جمع کی ہیں۔ حافظ منذری اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"اس موضوع پر اہل علم نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بہترین کتاب امام ابو عبد الرحمان نسائی کی ہے اور اس سے بھی بہتر کتاب ان کے شاگرد امام ابن السنی کی ہے۔ اور میں نے یہ کتاب مرتب کی ہے جو ان دونوں سے زیادہ جامع ہے لیکن طویل ہے۔ میں نے اس میں سندیں حذف کر دی تھیں کیونکہ پڑھنے والے طویل کتاب پڑھنے کی ہمت نہیں کرتے"۔ (۲۰)

دعا کرتے وقت ہاتھ اُٹھانا : حافظ منذری نے ایک رسالہ میں وہ تمام روایات جمع کر دی ہیں جن میں دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے۔ اس رسالہ کا تذکرہ حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب فتح الباری شرح صحیح بخاری کی کتاب الدعوات باب رفع الایدی فی الدعاء کے تحت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں :

فان فیه احادیث کثیرة افردها المنذری فی جزء

"اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں ہیں۔ حافظ منذری نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں جمع کر دیا ہے"۔ (۲۱)

الترغیب والترہیب : حافظ منذری کی تصانیف میں یہ بہت مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے صرف ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جن میں صراحت کے ساتھ ترغیب اور ترہیب یعنی نیک اعمال پر اجر و ثواب اور بد عملیوں پر سزا و عذاب کا مضمون ہے۔ امام منذری نے اس کتاب میں سندوں کو حذف کر دیا ہے' اور صرف کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں جن کتب حدیث سے حدیثیں نقل کی ہیں' ان کی تعداد ۷۲ ہے۔

اہل علم نے اس کتاب کی بہت پذیرائی کی ہے۔ چنانچہ اس کی تلخیصات بھی لکھیں اور شرحیں بھی' حواشی بھی تحریر کئے اور اس کے تراجم بھی کئے۔ تلخیص میں حافظ ابن حجر عسقلانی کی تلخیص بہت مشہور و معروف ہے' جو ۱۳۸۰ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی کوششوں سے "انتقاء الترغیب والترہیب" کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ (۲۲)

علمائے حدیث نے اس کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔ ان شروح میں امام برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم بن محمد المعروف بالناجی کی شرح معروف ہے۔ صاحب کشف الظنون اور حافظ سخاوی نے اس شرح کا ذکر کیا ہے۔ (۲۳) حواشی میں صرف ایک حاشیہ لکھا گیا ہے جو شیخ مصطفیٰ بن محمد عمارہ نے لکھا ہے۔ اس کا نام الفتح الجدید فی شرح احادیث الترغیب والترھیب ہے اور یہ مصر سے شائع ہو چکا ہے۔ (۲۴)

الترغیب والترہیب کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں اور یہ ترجمے مطبوع ہیں۔ سب سے بہتر ترجمہ مولانا محمد عبداللہ طارق رفیق ندوۃ المصنفین دہلی کا ہے جو ۱۳۵۲ھ میں دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ ترجمہ ۸ جلدوں میں مکمل ہوا اور اب مکمل ترجمہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہو چکا ہے۔

حواشی

(۱) ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۲۱ (۲) سیوطی : حسن المحاضرہ ج ۱' ص ۱۲۶
(۳) ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۱۰۹۔ سیوطی : حسن المحاضرہ' ج ۱' ص ۱۲۶
(۴) ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۶' ص ۳۔ سیوطی : حسن المحاضرہ' ج ۱' ص ۱۲۸
(۵) ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۶' ص ۳۔ سیوطی : حسن المحاضرہ' ج ۱' ص ۱۲۸
(۶) ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۲۱ (۷) ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۱۲
(۸) سیوطی : حسن المحاضرہ' ج ۱' ص ۱۴۹ (۹) ابن عماد : شذرات الذہب' ج ۵' ص ۲۷۷
(۱۰) ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۲۱ (۱۱) ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۱۰۸
(۱۲) ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۱۲ (۱۳) ابن عماد : شذرات الذہب' ج ۵' ص ۴۱۶
(۱۴) ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۹۱ ۴۔ ابن عماد : شذرات الذہب' ج ۵' ص ۸۸۔
صدیق حسن خان : التاج المکلل' ص ۲۳۱
(۱۵) ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۱۰۹ (۱۶) ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۱۰۹
(۱۷) ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۱۲۱ (۱۸) صدیق حسن خان' التاج المکلل' ص ۱۶۶
(۱۹) ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۱۲ (۲۰) حاجی خلیفہ : کشف الظنون' ج ۲' ص ۱۳۶
(۲۱) ابن حجر : فتح الباری' ج ۱۱' ص ۱۲۰
(۲۲) محمد عبداللہ طارق : الترغیب والترہیب اردو' ج ۲' ص ۵۱
(۲۳) حاجی خلیفہ : کشف الظنون' ج ۱' ص ۲۸۱۔ سخاوی : الضوء اللامع' ج ۴' ص ۱۶۶
(۲۴) محمد عبداللہ طارق : الترغیب والترہیب اردو' ج ۱' ص ۵۷۰

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

قربِ الٰہی کے دو مراتب

کتاب و سنّت کی روشنی میں

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

حضرت امام شامل رحمۃ اللہ علیہ

مؤلف : اظہار احمد قریشی

یہ کتاب ماضی قریب کی روس، چیچنیا جنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ جنگ میں چیچن لوگ جس بہادری اور بے جگری سے لڑے ہیں اس پر ساری دنیا ششدر رہ گئی۔ انہوں نے اپنی آبادی کا کل اٹھواں حصہ شہید کروالیا لیکن روس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ کتاب کے مؤلف اظہار احمد قریشی کے بقول حضرت امام شاملؒ کا نام انہیں اسی جنگ کے دوران معلوم ہوا اور جب ان کے متعلق انہوں نے کتابوں کا مطالعہ کیا، جو زیادہ تر انگریزی زبان میں تھیں، تو ایک عظیم مسلم ہیرو کی نہایت شاندار شخصیت سامنے آئی، جن کی عظمت نے انہیں اس کتاب کی تحریر پر مجبور کر دیا۔

فزکس کے میدان کے پاکستان کے ایک مایۂ ناز سائنس دان جناب ایم ایم قریشی نے جن کی عمر ۷۵ برس ہے اور اب وہ ریٹائرمنٹ کے بعد مسلمان سائنسدانوں کے کارناموں کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں، اس کتاب کے مطالعے کے بعد چیچنیا کے لوگوں پر حضرت امام شاملؒ کی جہادی تحریک کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف کتاب کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا :

"آپ لوگ آج کے کسی چیچن سے ملے ہیں؟ میں کئی لوگوں سے گزشتہ سردیوں میں ملا ہوں جبکہ ان کے دو تین گروپ یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان میں وہاں کے پارلیمنٹ کے دو ارکان بھی تھے۔ یہ سب کے سب جذبۂ ایمانی سے لبریز تھے"۔

اس جذبہ کو جگانے میں حضرت امام شاملؒ کے کارناموں کا بہت بڑا دخل ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی عظمت اور حسن سے مسحور ہو کر یہ کتاب تحریک استحکام پاکستان میں ولولۂ تازہ پیدا کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ حضرت کے بے داغ کردار کی گواہی ان کے دشمنوں نے بھی دی ہے۔ اس کتاب میں حضرت امام شاملؒ کی جہادی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی زندگی کے بہت سے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے ان کی شخصی عظمت کا نقش پڑھنے والے کے ذہن و قلب پر ثبت ہوتا ہے۔

قریباً دو صد صفحات پر مشتمل یہ کتاب صفہ پبلشرز ۱۹۔اے ایبٹ روڈ لاہور نے شائع کی ہے اور مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور پر بھی دستیاب ہے۔

Nov. 1998 Reg. No. CPL. 126

MONTHLY Vol. 17

Hikmat-e-Quran

LAHORE No. 11

صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں علی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

ضرور مطالعہ کیجئے ـــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۸۰ روپے ■ غیر مجلد -/۶۰ روپے